ساتواں ایڈیشن

بلوچی زبان و ادب

ایک جائزہ

غوث بخش صابر

اکادمی ادبیات پاکستان

بلوچی زبان وادب

ایک جائزہ

غوث بخش صابر

اکادمی ادبیات پاکستان

اشاعت ہفتم	۲۰۱۵ء
نگرانِ اعلیٰ	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
طباعت	علی یاسر
تعداد	۳۰۰۰
مطبع	نست پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد:-/۲۰۰ روپے
	پیپر بیک: ۱۸۰ روپے

اشاعت اول	۱۹۹۹ء
اشاعت دوئم	۲۰۰۵ء
اشاعت سوئم	۲۰۰۷ء
اشاعت چہارم	۲۰۱۲ء
اشاعت پنجم	۲۰۱۲ء
اشاعت ششم	۲۰۱۴ء

ISBN: 978-969-472-280-1

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

رابطہ: 051-9269712, 051-9269711

ای میل: info@pal.gov.pk

فہرست

پیش نامہ

بلوچی زبان وادب: ایک جائزہ اکادمی ادبیات پاکستان کی اہم کتاب ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان، وطنِ عزیز کی تمام اہم زبانوں میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی ترویج وفروغ کے لیے کام رہی ہے۔ اس حوالے سے مختلف اشاعتی منصوبوں کے ذریعے پاکستانی زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے موضوع پر کتب شائع کی گئی ہیں۔ ہمارا مقصد تمام اہم پاکستانی زبانوں کے ادب اور ادیبوں کو ایک دوسرے کے خطوں، زبانوں اور لوگوں تک متعارف کرانا ہے۔

کتاب بلوچی زبان وادب ہماری اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں شائع کی گئی۔ اکادمی نے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے بلوچستان کے ممتاز اہلِ قلم "سید ہاشمی: شخصیت اور فن"، "میر گل خان نصیر: شخصیت اور فن"، اور عبداللہ جان جمالدینی: شخصیت اور فن" کے حوالے سے کتابیں شائع کی ہیں اور دیگر کئی معمارانِ ادب پر کام ہو رہا ہے۔

جناب غوث بخش صابر نے اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے بلوچی زبان وادب کا ایک اجمالی جائزہ لیا ہے، جو اردو زبان میں ہے۔ اس کے لیے ہم جناب غوث بخش صابر کے ممنون : ں۔

یہ کتاب تحقیقی اور علمی ں پر بہت پسند کی جا رہی ہے۔ نـ نے بلوچستان رَ ٠د ،لہ ادبی ولسانیاتی تاریخ کو مختصراً لیکن جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں بلوچی زبان کے قدیم اور جدید شعراء کی مختصر تاریخ بھی شامل ہے۔ بلوچستان پاکستان کا ایک اہم صوبہ ہے اور کثیر اللسانی ادب کا گہوارہ ہے۔

بلوچی ادب کی ترویج و ترقی میں یہاں کے لکھاریوں کی خدمات انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ کتاب میں میر گل خان نصیر، سید ظہور شاہ ہاشمی، محمد حسین عنقا، آزاد جمالدینی، عبداللہ جان جمالدینی، اکبر بارکزئی اور کئی دیگر ادبا و شعرا کی ادبی خدمات کا احاطہ جناب غوث بخش صابر نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ پاکستانی زبانوں نے اسے بلوچی زبان و ادب کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے یہ بات باعثِ اعزاز ہے۔ انشاءاللہ آئندہ بھی محققین اور طالب علم اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ ہمارے لیے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ یہ اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو (تمغۂ امتیاز)
چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

آغاز

یہ میرے لیے بہت اعزاز اور بڑی عزت کی بات ہے کہ میں بلوچی ادب کی پچاس سالہ تاریخ مرتب کرنے بیٹھا ہوں، جس میں نہ صرف حریت فکر ونظر کے حوالے ہیں بلکہ نظم ونثر کی قابل قدر تخلیقات کا ذکر، وطن کی محبت میں مخمور شعراء، زمین کی مٹی سے پیار کرنے والے دانشوروں، ژرف نگاہ اور حق آگاہ صاحب نظر اہل قلم کا بیان ہے اور نامساعد حالات میں علم وادب کی ترویج واشاعت، وسائل اور حقیقی سرپرستی سے محروم اداروں کی قابل فخر جدوجہد کی داستان ہے۔ یہ ان اصحاب کی خدمات کو خراج تحسین بھی ہے کہ جنہوں نے زبانوں کی ترقی سے نفرت کرنے والوں کی نفرتوں کا جواب محبت سے دے کر جدید بلوچی ادب کی بنیادیں، حب وطن، حب ملک اور قوم ومحبتِ انسانی پر استوار کیں۔ وہ آج ہم میں ہیں تو ان کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت وتکریم ہے اور اگر ہم سے جدا ہو چکے ہیں تو ان کی علم پروری، زبان دوستی، آزادی اور انصاف سے ان کی وابستگی کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت۔

جدید بلوچی ادب کی بنیادوں میں دوسری متعدد ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ابتداً شعری تخلیقات ہی کا مواد ہے۔ شعروشاعری جو بلوچی زبان میں صدیوں سے موجود ہے۔ اظہار کے اس وسیلے کے ذریعے نہ صرف ہم تک تاریخی واقعات پہنچے ہیں جن سے بلوچی قوم کی تاریخ کی ترتیب میں مدد ملی ہے بلکہ رزم وبزم، رسومات، طرز حیات اور قبائلی روایات کی شناخت بھی آسانی سے ہوئی ہے۔ قدیم سے لے کر اب تک کی شاعری کے ادوار موضوع کے اعتبار سے باہم پیوستہ ومربوط ملتے ہیں۔ اس سے بلوچ قوم کی طبعی حالتوں کی عکاسی ہوتی ہے، اس کے حریت کش مزاج، وطن پرستی، صبر قناعت، جفاکشی اور بلند نظری کی خبر ملتی ہے۔ بلوچوں کی سرزمین مدتوں سامراجی قوتوں کے لیے باعث تحریص رہی ہے مہم جو حکمرانوں نے بلوچوں کو غلام بنانے اور ان کی زمین ہتھیانے کے لیے آئے دن یلغاریں کی ہیں خشکی اور سمندر کے راستوں سے ظالم چڑھ کر آتے رہے ہیں۔

بلوچی شجاعت نے کبھی حمل جیئند بن کر، کبھی محراب خان کے روپ میں ان کا راستہ روکا ہے۔

پہاڑوں کے یہ سنگین قلعے، صحراؤں کے یہ طول وطویل سلسلے، سمندر کی پرشور لہریں، کوہ سلیمان کی دشوار گزار وسعتیں گواہ ہیں کہ بلوچوں نے آزادی کا سودا کسی قیمت پر بھی نہیں کیا۔ وہ غاصبوں سے ہمیشہ نبرد آزمار ہے، قہرمان طاقتوں کے سامنے سرنہیں جھکایا۔ آزادی کا چراغ ان کے دلوں میں ہمیشہ روشن رہا اور اسی جذبے کی کوکھ سے ادبی شاہکار صورت پذیر ہوتے رہے۔ جب آزادی کا پرچم ۱۹۴۷ء میں لہرایا تو بلوچوں نے اسے اپنی عظیم قربانیوں کا انعام سمجھ کر سر تسلیم خم کیا۔ ایک آزاد وطن میں سر بلند رہ کر زندگی گزارنے کی تمنا میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ بلوچوں کے سعی وعمل کی تاریخ واضح اور روشن ہے ۔انہوں نے آزادی کے دلدار گان کی عزت کی اوران سے اسی عزت کے خواہاں رہے۔ وہ اصحاب جو تحریک آزادی میں پیش پیش رہے تھے وہ تعمیر وطن میں بھی اسی جوش وجذبے سے شامل رہے۔ گو ہماری قومی آزادی کے بدخواہ برابر ایسی کوششوں میں مصروف رہے کہ آزادی کے متوالے غیور بلوچوں کو دوسری وحدتوں سے غلط فہمیاں پھیلا کر دست وگریباں کرائیں ان کے اس طرح کے ہتھکنڈوں سے بلوچ عوام کو بارہا مبتلائے مصائب ہونا پڑا۔ بلوچوں کے محبّ وطن رہنماؤں کو دبانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ بلوچ شعراء، ادباء کی تحقیر وتکذیب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ سیفٹی ایکٹ کو حرکت میں لاکر اہل قلم کو پابند سلاسل کیا جاتا رہا مگر بلوچ اہل قلم جن کی تخلیقات میں سحر کی پاکیزگی، عرفان وحق آگہی رچی بسی تھی، اپنی ڈگر پر اسی رفتار سے گامزن رہے وہ ظلم وجبر کے خلاف رہے، انہوں نے حکومتوں کی غلط روش پر صدائے احتجاج بلند کی مگر وہ آزاد مملکت کے وفادار رہے اور پاکستان میں جب بھی امتحان کی گھڑی آئی بلوچ اہل قلم نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ آزادی سے یہ ان کی وابستگی کی روشن مثال ہے۔

جدید بلوچی ادب میں جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے نثر سے شاعری کی سبقت رہی ہے۔ میر گل خان نصیر وہ پہلے بلوچی شاعر ہیں جن کا بلوچی کلام ''گلبانگ'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ایک ادبی نشست میں میر گل خان نصیر نے جدید بلوچی ادب پر راقم السطور سے بیان کیا تھا:

بلوچی شعراء جن میں وہ خود بھی شامل تھے شروع میں اردو، فارسی میں شعر موزوں کیا کرتے تھے۔

اس کی ایک اور مثال مشہور بلوچ شاعر اور دانشور میر محمد حسین عنقا کی کتاب ''رحیل کوہ'' ہے اردو، فارسی میں اشعار کا یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔

دوسرے مشہور ادیب اور شاعر سیّد ظہور شاہ ہاشمی بھی ابتداً اردو فارسی میں اظہار خیال کرتے تھے۔

میر گل خان نصیر نے کس طرح بلوچی شعر گوئی کا آغاز کیا یہ بھی ایک متاثر کن واقعہ ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

''۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا پشاور میں ایک سیاسی جلسہ ہو رہا تھا۔ شریک شعراء پشتو، سندھی میں اپنا کلام پیش کر رہے تھے مجھے خاصی ندامت ہوئی کہ اپنی زبان چھوڑ کر کسی دوسری زبان میں اظہار کرتا۔ چنانچہ میں نے اپنا کلام نہیں سنایا اور اسی دن سے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ آئندہ سے بلوچی زبان کو ذریعہ اظہار بناؤں گا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک میں نے جو کچھ کہا وہ ''گلبانگ'' میں شامل ہے میں یہ اعتراف کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ اس دور کی سیاسی و سماجی تحریکات میں سب سے زیادہ مجھ پر علامہ اقبال کا اثر تھا۔''

میر گل خان نصیر کی بلوچی شاعری اگرچہ اس سلسلے میں پیش قدمی تھی مگر اس کی حیثیت انفرادی سوچ کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بلوچی زبان میں تحریر و تخلیق ایک حسین خواب تھا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کے دن جب بانی پاکستان نے انتقال فرمایا تو ریڈیو پاکستان، کراچی سے ماتمی پروگرام نشر کیے جارہے تھے۔ ضرورتاً فیض محمد بلوچ کو قلیوں کی صف سے نکال کر نشر گاہ میں داخل کیا گیا اور ان کی آواز میں ''موتک (مرثیہ)'' نشر کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر بلوچی زبان کی ترویج کی جانب قدم بڑھائے گئے۔ اس واقعے کے بعد بلوچ حلقوں کی طرف سے بلوچی زبان میں پروگرام نشر کرنے کے مطالبات بڑھنے لگے یوں بلوچی زبان ریڈیو پاکستان، کراچی کی نشری زبانوں کی صف میں آگئی۔ جناب مولانا خیر محمد ندوی اور سیّد ظہور شاہ ہاشمی اس شعبے کے نگران بنائے گئے مختصر دورانیے میں خبریں، کبھی کبھار تقریریں اور موسیقی کے پرگراموں نے لکھنے والوں کو اس جانب متوجہ کیا۔

مولانا خیر محمد ندوی جن کی نگرانی میں بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی، لیاری، کراچی اور کراچی میں تعلیمی مشاغل کو آگے بڑھانے کا کام ہو رہا تھا انہوں نے جُرات رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلوچی زبان میں پہلا ماہنامہ ''اومان'' ۱۹۵۰ء میں جاری کیا، یہ جریدہ کوئی سال بھر چھپا اس میں ہلکے پھلکے مضامین، ادبی خبریں اور شعراء کا کلام شائع ہوتا رہا مگر علمی پیمانے پر لوگوں کی توجہ حاصل نہ کرسکا، تاہم خشت اول کے طور پر ''اومان'' کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ''اومان'' کے بند ہونے کے چار پانچ سالوں کے بعد نوجوان طلباء اور اہل قلم نے ایک مرتبہ پھر سے انگڑائی لی اور ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جو بلوچی زبان و ادب کی آبیاری کرسکے۔ اس سلسلے میں کیے گئے عملی اقدامات کی تفصیل ہمیں جناب اکبر بارکزئی کے اس انٹرویو میں ملتی ہے جو ماہنامہ ''آساپ''، تربت کے دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

انٹرویو(اکبر بارکزئی)

''یہ ۵٦-۱۹۵۵ء کی بات ہے جب بلوچی ادب نے میری توجہ جذب کی، ان دنوں سیّد ظہور شاہ، میر گل خان نصیر، میر محمد حسین عنقا، آزاد جمالدینی کا بہت شہرہ تھا۔ بلوچی زبان کی ایک تنظیم ''سر چمگ'' بنی تھی جس کے سرخیلوں میں میر عبداللہ جان جمالدینی اور میر غلام محمد شاہوانی قابل ذکر ہیں۔ ہمارے گھروں میں بزرگوں کے درمیان اکثر بلوچوں کی پسماندگی بالخصوص ایرانی بلوچستان میں بلوچوں کی حالت زار کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ ایرانی شاہوں نے بلوچوں پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے تھے ان کی وجہ سے ہمارے بزرگ ۱۹۲۸ء میں ہجرت کر کے کراچی میں آبسے تھے۔ یہاں ایرانی بلوچستان کی صورتِ حال کے علاوہ بلوچستان اور تحریک آزادی کے حوالے سے یوسف عزیز مگسی اور ان کے رفقاء کی جدوجہد کی باتیں، بلوچستان اور بلوچی زبان کے مسائل و معاملات زیر بحث رہتے'' اومان'' کی اشاعت پر مسرت اور اس کے بند ہونے پر افسوس کی عجیب کیفیات سے ہم زمانہ طالب علمی ہی میں دو چار رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی ہم اپنی بساط کے مطابق بلوچی میں کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے، تقریباً ساری کی ساری سیاسی تحریکوں نے کراچی میں جنم لیا۔ یوسف علی عزیز مگسی، میر محمد حسین عنقا سے لے کر میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر کی جدوجہد کا مرکز لیاری، کراچی رہا۔ ۱۹۵٦ء میں میر غوث بخش بزنجو نے چاکیواڑہ میں جو جلسہ عام کیا تھا میں بھی اس میں شریک ہوا۔ ان کے قریب ایک سرخ و سفید جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ جلسہ عام کے آخر میں ان سے ان کا کلام سننے کی فرمائش کی گئی تھی، یہ میر گل خان نصیر تھے۔ ایک طالب علم کے طور پر میں ان سے مل چکا تھا، سیّد ظہور شاہ بھی ایک آدھ مرتبہ مجھ سے ملے تھے۔ میں اور عبدالصمد امیری ہم مکتب تھے، امیری نے مجھے مراد ساحر سے ملایا۔ بعد میں امیری، میں اور مراد ساحر گویا ایک مثلث بن کر رہ گئے۔ عبدالصمد امیری سے بعض اوقات اختلافات بھی ہوئے مگر ان کے ادبی مقام کا میں ہمیشہ معترف رہا۔ ایک دن مراد ساحر نے بتایا کہ آزاد جمالدینی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ لی مارکیٹ میں شاہکار کمپنی کے نام سے ایک چھوٹی سی دوکان ہوا کرتی تھی ہم آزاد سے وہیں پر ملے۔ نہایت محبت اور تپاک سے اس طرح بغل گیر ہوئے جیسے بچپن سے ہم ایک دوسرے کے دوست ہوں۔ اس ملاقات کا اثر زندگی بھر قائم رہا۔ آزاد جمالدینی نے بتایا کہ ہم ایک'' سر چمگ یعنی سرچشمہ ادبی رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں لکھتے، میں بھلا کیا لکھتا ایک افسانہ ترجمہ کر کے

پیش کیا جسے انہوں نے بہت پسند کیا، بڑی تعریفیں کیں یہ اکابرین بلوچی ادب کا ایک وصف تھا نہ وہ نو آموز لکھنے والوں کی ہمت بڑھاتے تھے۔ بلوچی ادب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ عموماً ادیب اور سیاست دان ایک ہی شخصیت کے دو نام ہوا کرتے تھے جیسے یوسف عزیز مگسی، میر محمد حسین عنقا اور میر گل خان نصیر جن کا سیاست اور ادب سے یکساں تعلق رہا ہے۔ اسی مناسبت سے میں بھی سیاست اور ادب دونوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ۵۵-۱۹۵۴ء ''داد شاہ تحریک'' نے کئی ایک سرگرم شخصیتوں کو متعارف کرایا۔ ان میں جمعہ خان پیش پیش تھے۔ یوسف نسکندی، جان محمد (آج کے مولانا جان محمد) اس تحریک کے صدر الیاس داد اللہ اور سیکرٹری جمعہ خان تھے۔ ہم سب ان سے بہت متاثر تھے۔

ان سرگرمیوں کے دوران میں ہم سب کا ماہنامہ ''بلوچی'' کراچی کے دفتر آنا جانا رہا، آزاد جمالدینی اور میر عبداللہ جان جمالدینی سے میل جول بڑھتا گیا۔ جمعہ خان کا ریڈیو سے تعلق تھا گو ادبی امور میں ان کی دلچسپی ہم جیسی نہ تھی۔ مگر ''سر جمگ'' کے باقی نہ رہنے اور عبدالصمد امیری کا ملک چھوڑ کر چلے جانے سے جیسی بے حسی طاری ہوگئی تھی۔ اسے توڑنے کے لیے بلوچی اکیڈمی کا قیام ناگزیر تھا بلوچی اکیڈمی بنی اگرچہ باقاعدہ انتخابات نہیں ہوئے تھے لیکن جمعہ خان اس کے صدر اور میں (اکبر بارکزئی) سیکرٹری بن گئے۔ مراد ساحر، عبدالرحیم جانی ہمارے ساتھیوں میں تھے عبدالرحیم صاحب ان دنوں ڈائریکٹر سوشل ویلفیئر ہیں۔ ابوالحسن، قاضی عبدالرحیم صابر وقتاً فوقتاً راستہ بھول کر اس طرف آنکلتے۔ ''بلوچی اکیڈمی'' (کراچی) ثقافت اور سیاست کا مرکز بنا تو سی آئی ڈی والوں نے ہماری جان عذاب میں ڈال دی ہر دوسرے تیسرے دن آدھمکتے، ایک مرتبہ تو چھاپہ بھی پڑا۔ جمعہ خان کا ساتھ چھٹا۔ اس زمانے میں مراد آوارانی اور مولانا خیر محمد ندوی نے بھی بار ہا ہمیں شرف ملاقات بخشی تھی۔ حالانکہ ہم پر قوم پرستی، علیحدگی پسندی، پاکستان دشمنی، اسلام دشمنی اور کمیونسٹ ہونے کے بہتان لگتے رہتے تھے۔ نا گمان جمعہ خان کلانچی کلاسیک طرز کے ایک شاعر تھے انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہماری خواہش تھی کہ جدید بلوچی شاعری پر مشتمل ایک نمائندہ کتاب شائع کریں، نمائندہ کتاب تو شائع نہ ہو سکی۔ البتہ ایک کتابچہ ''مستاگ'' کے نام پر منظر عام پر آیا۔ ''مستاگ'' کی طباعت پر کل پانچ سو روپے خرچ ہوئے تھے مگر اتنی رقم کی فراہمی بھی ہمارے لیے جوئے شیر لانے کے برابر تھی۔ وسائل کی عدم دستیابی ایک طرف پولیس کے شدائد دوسری طرف، نتیجہ یہ نکلا کہ اکیڈمی برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ ساتھی سب ایک ایک ہو کر جس کا جہاں سینگ سمائے چل دیا۔ جمعہ خان جا چکا تھا میں بھی کوئٹہ کی طرف نکل گیا۔ سیاست کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑی۔ کوئٹہ میں میر عبداللہ جان جمالدینی، میر شیر محمد مری سے بہت زیادہ قربت رہی۔ کراچی

دوبارہ مراجعت کرنے پر دوستوں کو سیاسی سرگرمیوں میں مصروف پایا مگر ہم نچلے نہیں بیٹھے بلوچی اکیڈمی کا دوبارہ احیاء ہوا۔ مراد ساحر اس کے سرپرست قرار پائے دفتر بھی ان کے گھر کے برابر ہی بنا۔ اس اثناء میں ایک خاص واقعہ پیش آیا۔

پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے ایک کانفرس کا اہتمام کیا۔ علاقائی (قومی) زبانوں کے حوالے سے ہمیں دعوت نامہ بھجوایا گیا۔ ان دنوں میر شیر محمد مری، کراچی آئے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ ایک سینئر دانشور کی طرح مصروف کار تھے۔ منتظمین نے بلوچی زبان وادب پر دو مقالات تیار پیش کرنے کی درخواست کی تھی۔ بلوچی ثقافت پر میں نے اپنا مقالہ تیار کرلیا، ایک ہدایت یہ بھی دی گئی تھی کہ مقالات کے اردو، انگریزی تراجم بھی فراہم کیے جائیں اس زمانے میں ملک محمد طوقی بھی ہمارے قریب آچکے تھے ہر چند کہ دور اول میں وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے کیونکہ فکری طور پر جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور ہماری سرگرمیوں کو ناپسند کرتے تھے مگر اب ان میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ ہم بہت خوش تھے کہ ملک صاحب جیسے پڑھے لکھے بلوچی کے معروف سخنور اور اہل قلم ہم میں شامل ہوئے تھے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ہم دو مقالے تیار کرتے، ہم نے تیار بھی کرلیے مگر میر شیر محمد مری کا مقالہ بہت طول و طویل تھا اس لیے ایک ہی مقالہ پیش کرنے پر اکتفا کیا، میر شیر محمد مری کا موضوع ''زبان وادب کی تاریخ'' تھا۔ بعد میں یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ ہم نے مقالات لکھے، میں اور ملک طوقی دن رات ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔ ہمارے وفد میں میرے علاوہ مراد ساحر، شیر محمد مری، محمد بیگ بیگل، لالہ (لال بخش) رند، یوسف جان اور ملک محمد طوقی شامل تھے۔ یوسف جان بوجوہ اس کانفرنس میں نہیں پہنچ سکے البتہ اشرف سربازی نے ان کی جگہ لی تھی، بلوچستان کا وفد سب سے بڑا تھا۔ مغربی پاکستان اسمبلی ہال میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں ون یونٹ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ پنجابی میڈیا، مہاجر میڈیا اور حکومتی ابلاغ نے قومیت کے حوالے سے اس کانفرنس کی کھل کر مخالفت کی اور اسے ون یونٹ کے خلاف سازش کا نام دیا، بیشتر اخبارات ورسائل نے بیک آواز ہماری مذمت کی، تاہم فقیر محمد فقیر کے رسالہ ''پنجابی ادب'' اور پروگریسو پیپرز کے اخبارات ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' نے ہماری حمایت اور مدد کرنے میں منصفانہ کردار ادا کیا۔ مخالف اخبارات ورسائل میں ''چٹان'' کے شورش کاشمیری ''نوائے وقت'' کے حمید نظامی اور مسلم لیگی ذہنیت کے دوسرے تمام اخبارات نے شدید مخالفت کی۔ بنیاد یہ تھی کہ مغربی پاکستان اسمبلی ہال میں ون یونٹ کے خلاف سازش کی جارہی ہے۔ مخالفتوں کے باوجود ہماری یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔

کانفرنس کے منتظمین نے اپیل کر رکھی تھی کہ اس کانفرنس کو غیر سیاسی رکھا جائے۔ مگر ہمارا وفد ایسا تھا جس کے بیشتر مندوبین کا سیاست سے تعلق تھا۔ میر شیر محمد مری کا تعلق بائیں بازو سے تھا جبکہ ہمارے دوسرے ساتھی ''نیپ'' کے رکن تھے۔ پنجاب سے فقیر محمد فقیر، وکیل محمد، حیات خضر، رشید بھٹی، میجر اسحاق، شریف کنجاہی کے نام مجھے یاد ہیں۔ سندھ سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب جو ایک روشن خیال دینی عالم ہیں۔ پشتون مندوبین میں ڈاکٹر مولانا عبدالقادر، پشاور کے ایک دو دوسرے دوست بھی آئے تھے۔ بلوچستان سے پشتون کی نمائندگی ایک صاحب، ظفر الاسلام کر رہے تھے۔''

اکابرین جدید بلوچی ادب

بلوچی شعروادب کی تخلیق، تحقیق، ترتیب، تدوین، کتابوں کی اشاعت اور زبان کے پرچم کو ہرقسم کی مشکل صورت حال میں بلند رکھنے کا عزم بلاشبہ غیر معمولی اور محنت طلب کام رہا ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ بلوچی زبان مطلوبہ سرکاری سرپرستی سے محروم رہی ہے اور لکھنے والوں نے جو کچھ بھی لکھا، چھپوایا وہ بالکل رضاکارانہ اور جلب منفعت سے عاری تھا۔ ان اہل قلم، ادیبوں، شاعروں پر بلوچی زبان ہمیشہ ناز کرتی رہے گی جنہوں نے اپنے وسائل، اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنی نجی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر بلوچی زبان کی کتب ورسائل کی اشاعت پر صرف کیے، خود جیلوں میں محبوس رہے مگر ان کی محبت زبان کی ترقی سے بندھی رہی۔ خود مرض الموت میں مبتلا رہے مگر اپنا اثاثہ علاج کے بجائے زبان کے گیسو سنوارنے کے لیے پیش کیا۔ نان شبینہ کے لیے فکرمند دانشوروں نے اپنا اور اپنے عیال واطفال کا غم نہیں کیا بلکہ بلوچی زبان کے غم کو سینے سے لگائے رکھا۔ یہ سطور خراج تحسین ہیں ان اکابرین بلوچی ادب کی خدمت میں جن کی ادبی خدمات مینارۂ نور بن کر آنے والی نسلوں کو بلوچی زبان کے روشن مستقبل کی نوید دیتی رہیں گی۔

میر گل خان نصیر

یہ حوالہ تو قبلاً دیا جا چکا ہے کہ بلوچی ادب میں خشت اوّل ''گلبانگ'' کے نام سے میر گل خان نصیر نے رکھی، انہوں نے غربت میں، قفس کے غم انگیز ماہ وسال میں، دارو گیر کے طوفانوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی بلوچی زبان کو فراموش نہیں کیا۔ نغمہ حریت لکھا، بلوچی غیرت وعزت کو حوالہ بنایا۔ امن، انصاف، محبت واخوت کے گیت گائے، صداقت، بردباری، روشن خیالی اور اپنی قوم کی عظیم الشان روایات کی تابناکی کو شاعری میں عنوان بنا کر بلوچ عوام میں اتنے مقبول ہوئے کہ عوام نے انہیں سرِ شاعر یعنی ملک الشعراء کا خطاب پیش کیا۔

سیّد ظہور شاہ ہاشمی

بلوچی زبان کی خدمت کے باب میں دوسرا محترم نام سیّد ظہور شاہ ہاشمی کا ہے۔ جنہوں نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۸ء تک درجنوں کتابیں لکھیں، ان کو چھپوانے اور لوگوں تک روشنی پہنچانے کے لیے رضا کارانہ طور پر دیارِ غیر میں غربت نصیب رہ کر اپنی دولت، اپنی صحت، اپنے گھر والوں کی مفارقت کی پروا، نہ کرتے ہوئے وہ ادبی کارنامہ انجام دیا جو کسی ادارے سے بھی ممکن نہیں۔ تپدق کے موذی مرض میں مبتلا اس شیدائے بلوچی نے شعروادب کے ذریعے زبان کو زندگی بخشی۔

میر آزاد جمالدینی

بلوچی زبان وادب، میر آزاد جمالدینی کی محبت سے معمور قربانیوں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا رہے گا۔ آزاد جمالدینی بلوچی زبان کی شمع کے وہ بےلوث پروانے ہیں جنھیں زبان کی ترقی، قوم کی تعمیر، پسماندگی سے رہائی کی لگن ایک لحہ بھی چین سے رہنے نہیں دیتی تھی۔ جنہوں نے اپنے متمول خاندان کا سرمایہ، زبان کی محبت میں جھونک دیا، فقر و فاقہ جن کے آہنی عزم کے سامنے بےحقیقت تھا، پاکستان میں رہے یا ایران میں یا کسی اور ملک میں غریب الوطنی کی زندگی گزاری جو کچھ کمایا، جو کچھ پایا بلوچی زبان کی نذر کر دیا۔ وہ جہاز میں بھی سفر کرنے کی استطاعت رکھتے تھے مگر انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ وہ اپنی سہولت کے لیے اپنے آرام اور آسائش کے لیے اس سرمائے کو خرچ کریں جس کی بلوچی زبان کو ضرورت ہے وہ بس میں دسمبر کی شدید سردی میں شبانہ روز مکران کا سفر کر کے نمونیہ اور دوسری جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور اپنی جان بلوچی زبان پر نثار کر دی۔

میر شیر محمد مری

ایسی ہی ستائش کے سزاوار میر شیر محمد مری ہیں۔ جو مدتوں زبان وادب، قوم کی بہتری اور اتحاد و یکجہتی کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، مصائب و مشکلات کا خندہ پیشانی سے

مقابلہ کیا اور قوم کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جگہ بنائی۔ بلوچی ادب رہتی دنیا تک میر شیر محمد مری کی خدمات کو نہیں بھلا پائے گا۔

میر محمد حسین عنقا

میر محمد حسین عنقا، ایک اور ایسی ہستی تھے جنہیں بلوچی زبان وادب سے عشق تھا۔ وہ بلوچوں کی دکھ بھری زندگی پر ہمیشہ کڑھتے رہے، عوامی جلسوں میں اپنے کلام سے خود روتے دوسروں کو رلاتے، میدان عمل کے یہ شہسوار ملک بھر کے زندانوں میں قومی مفادات، زبان، ثقافت اور آبرومندانہ زندگی کی تمنا میں محبوس رہتے۔ قلعہ لاہور اور قلی کیمپ میں تعذیب آشنا رہے مگر ان کی زبان پر یہی نعرہ رہا کہ۔

پر چہ عنقا نزور، آزوراک مئے
اگہ ہردکانی یک حاک انت

دیگر محبّ بلوچی اہل قلم و دانشور

خراج تحسین کے مستحق ہیں میر عبداللہ جان جمالدینی، ملک محمد پناہ، عبدالکریم شورش (کریم امن)، میر بشیر احمد بلوچ، غور حاجی عبدالقیوم بلوچ، مراد ساحر، عبدالصمد امیری اور درجنوں وہ دانشور اور اہل قلم جن کے بے پناہ عزم کے آگے مصائب کے پہاڑ سرنگوں ہوئے۔ انہوں نے وطن کی محبت، قومی آدرش، زبان، ادب، تاریخ، ثقافت اور متعدد دوسرے شعبوں میں اپنی ذاتی کاوش وکاہش سے کام لیا۔ مخالفتوں سے نہیں گھبرائے، اپنا بیش قیمت وقت زبان کی ترقی، ادب کی تخلیق اور قوم کی توقیر بڑھانے میں صرف کیا۔ ان ہستیوں کی اور ایسے ہی بے مثل پروانوں کی قابل قدر خدمات آئندہ صفحات میں اپنی اپنی جگہ تفصیل سے بیان ہوں گی۔

انفرادی کوششیں

بلوچی ادب کی تخلیق، اشاعت، تحقیق و ترویج میں چند اہل قلم، شعراء اور دانشوروں نے ذاتی طور پر ایک عمر وقف کر کے کام کیا ان میں میر گل خان نصیر اور سید ظہور شاہ ہاشمی کے نام سر فہرست ہیں۔ کسی ادارے نے بھی شاید اس محنت، لگن، محبت اور اخلاص سے بلوچی زبان، بلوچ قوم، بلوچی ادب و ثقافت کو اس طرح حرز جان نہیں بنایا جیسے ان دو عظیم شخصیتوں نے، آزاد رہے یا پابند سلاسل، صحت مند رہے یا عوارض میں مبتلا، وطن میں رہے یا غریب الدیار، ان کا بیشتر وقت اس قومی خدمت میں صرف ہوا۔

میر گل خان نصیر کی خدمات

میر گل خان نصیر کی تعلیم ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وطن کی آزادی کے لیے سرفروشوں کے اس گروہ میں شامل ہوئے جس کو میر عبدالعزیز کرد، نواب یوسف عزیز مگسی اور قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے بے خوف رہنماؤں نے ۱۹۲۳ء میں منظم کیا تھا۔ انجمن اتحاد بلوچاں، انجمن اسلامیہ اور قلات نیشنل پارٹی انگریزوں سے بالواسطہ اور بلا واسطہ جس طرح نبرد آزما رہے وہ بلوچستان میں تحریک آزادی کا روشن باب ہے لیکن ہمارا موضوع چونکہ سیاست نہیں اس لیے ہم صرف میر گل خان نصیر کی سیاست میں سرگرم ہونے پر جلاوطنی، قید و بند کے حوالے سے یہ اظہار کرنا چاہیں گے کہ انہیں جلاوطنی کے دنوں میں جیسے تجربات ہوئے اور قید و بند کے عرصے میں جہاں کہیں مہلت میسر آئی انہوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلم و قرطاس سے شناسائی پیدا کی، وہ ایک بسیار نویس اہل قلم تھے مگر جنہیں تجر [illegible]، احساسات کو نظم و نثر کی ہر صنف میں ڈھالنے کا فن ودیعت ہوا تھا۔ اردو، بلوچی اور براہوئی زبانوں پر قدرت و دسترس، تاریخ ادب اور ثقافت کے شعبوں میں ان کی رسائی نے انہیں دو درجن کے قریب تصانیف و تالیف میں کامیابی بخشی۔ تاہم یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کی تصانیف و تالیف میں تقدیم کا شرف پہلے

کس کتاب کو حاصل ہوا۔

میر گل خان نصیر اور میر غلام محمد شاہوانی کے درمیان گہرا ربط تھا۔ دونوں نے ایک مدت تک بلوچستان میں صحافت کے میدان میں بھی رفاقت جاری رکھی، تاہم ۱۹۵۸ء میں جب میر غلام محمد شاہوانی کا انتقال ہوا میر گل خان نصیر بھی صحافت سے کنارہ کش ہوئے۔ انکی کتابوں پر جو سنین درج ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب موصوف بیک وقت کئی کتابوں پر کام کرتے رہے ہوں گے۔

میر گل خان نصیر ایک محب وطن، ترقی پسند روشن خیال، بلوچی اوصاف سے متوصف شخص تھے۔ یہ خصوصیات ان کی شاعری اور دوسری تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری چونکہ عوامی امنگوں کی ترجمان تھی اس لیے انہوں نے اذکار، تشبیہات و استعارات کے پردے میں مقید ہونا پسند نہیں کیا بلکہ سہل ترین لفظوں میں اظہار خیال کرتے تھے۔ غزل سے کم، نظم سے زیادہ کام لیا کرتے تھے۔ شروع میں ان کے اس عوامی انداز کا مضحکہ بھی اڑایا گیا مگر جلد ہی ان کی اپنی حقیقی سوچ آزادی کی تڑپ، عوام سے محبت کے باعث معترفین کو اعتراف کرتے ہی بن پڑی۔

میر گل خان نصیر نے اردو، بلوچی اور براہوئی میں جو کتابیں لکھیں درج ذیل ہیں۔

اردو	بلوچی
تاریخ بلوچستان (حصہ اول، دوئم)	گلبانگ
بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی	شپ گروک
بلوچی رزمیہ شاعری	حمل جئیند
بلوچی عشقیہ شاعری	شیریں دوستین
کوچ و بلوچ	گرند
بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں	پرنگ
بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار (ترجمہ)	گلگال
جنگ نامہ مشہد (مثنوی)	شاہ لطیف گشیت (منظوم ترجمہ)
سرِ وادیِ سینا	بھیری برمش مع (انگریزی ترجمہ)
	ہون ءِ گوانک
	حپت حیکل

میر گل خان نصیر کی نثر کی کتابیں ہوں یا منظومات ان میں بلوچی قوم پرستی اپنے عروج پر ہے "شپ

گروک'' کوادبی حلقوں نے میر گل خان نصیر کی منتخب کتاب قرار دیا ہے اس مجموعہ میں ۱۹۶۰ء کا کلام ہے۔
گلبانگ سے ''شپ گروک'' تک دس سالوں کا عرصہ پھیلا ہوا ہے۔ جناب اکبر بارکزئی ''شپ گروک'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔

''نصیر جیسے بہت بڑے شاعر کے مجموعہ کلام پر چاہیے تو یہ تھا کہ انہی کی طرح کا کوئی نقاد دیباچہ لکھتا۔ میں حقیقت حال کا اظہار کرتا ہوں کہ میں خود کو ایلیٹ کے Universal Intelligence اور آرنلڈ کی عظیم الشان سنجیدگی High eriousness سے بالکل محروم سمجھتا ہوں کہ ان علماء کے نزدیک یہ دونوں اوصاف کسی نقاد کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ بایں ہمہ ذمہ داری مجھ جیسے نااہل کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے اسے اپنے قابل قدر قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔

نصیر کی شاعرانہ خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح کوئی خواندہ شخص اسے سمجھ سکتا ہے اسی طرح ایک ناخواندہ چرواہا، ایک باری بھی اسے سمجھ سکتا ہے۔ تاہم نصیر کی شاعری کو فی الواقع سمجھ لینے کے لیے اس دور کو اس کی تمناؤں، آرزوؤں کو جان لینا بھی لازمی ہے اس لیے کہ یہ شاعری انہی تمناؤں، آرزوؤں کی دنیا کو ہلا دینے والی صدا ہے، غم انگیز فغاں اور فاتحانہ رجز ہے، دل میں بپا ہونے والے طوفان اور حسین احساسات کا عکس ہے۔

ہر دور اپنے سابق ادوار سے مختلف ہوا کرتا ہے ہر دور کی کوکھ سے ایک نیا دور جنم لیا کرتا ہے اور پھر اس نئے دور سے ایک اور دور صورت پذیر ہوتا ہے۔ ہر نئے دور کے ساتھ ایک نیا انسان اس جہاں میں آتا ہے اور وہ دور اپنے ہمراہ نئی اقدار (valuae) اور نئے پیمانے (Criteria) لئے ہوئے آتا ہے زندگی ازل سے ارتقاء کی سیڑھیاں چڑھتی آ رہی ہے۔

یہ دنیا انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور بیسویں صدی اس سے بھی زیادہ نیا پن لیے ہوئے ہے۔ اٹھارویں صدی سے پہلے طبیعات (Metaphysics) اپنے شباب پر تھا۔ لوگوں کے لیے برکلے، کانٹ، ہیگل کے خیالات پر قائم فلسفہ سب کچھ تھا لیکن جاگیرداری اثرات جوں جوں مٹتے چلے گئے۔ (Metaphysics) کی جڑیں بھی کمزور ہوتی چلی گئیں۔ انیسویں صدی نے اپنے اقدار کی مدد سے ان جڑوں کو بنیاد سے نکال باہر کیا۔ اب طبیعات سائنس کے مقابلے میں بے بس ثابت ہوا اور مادیت پرستی کے خیال کو دیس نکالنے کا پروانہ ہاتھ میں تھما دیا۔

سائنس کی حکمت نے فلسفہ کو متاثر کیا فلسفے کی اقدار یکسر بدل کر رہ گئیں۔ ادبیات و ہنر (فن) نے ان

نئی اقدار کا خیر مقدم کیا۔ ڈارون، مارکس، اور آئن سٹائن نے پیکر انسانی کے مطالعے کو . ت آگے بڑھایا۔ زندگی کے پرانے اقدار کی عمارت دفعتاً منہدم ہو کر مٹی میں مل گئی۔ جاگیرداری کی لعنت تو گم ہو کر رہ گئی مگر انسانوں کی آزادی ہنوز سرمایہ داروں کے نوکیلے پنجوں میں گھٹ کر رہ گئی تھی، آزادی، قومی آزادی اور دوسری طرف کمزور اور مظلوم طبقات کی تحریک روز افزوں روبہ ترقی رہی۔ غلام اپنی زنجیریں توڑنے کے لیے باغی بنے اور اپنے آقاؤں کو للکارنے لگے۔ اس طرح کمزور، طاقتوروں سے ٹکرا گئے۔

بیسویں صدی نے اپنے ساتھ ایک نیا انسان متعارف کرایا، مشرق و مغرب سکڑ کر قریب آ گئے۔ دنیا کی غلام اور کمزور قومیں متحد ہو کر نعرہ زن ہوئیں۔ چین میں اگر کہیں کوئی آواز بلند ہوئی تو اسے امریکہ میں لبیک کہا جانے لگا۔ یہ وسیع دھرتی سمٹ گئی اور اس طرح سمٹ گئی کہ کمزور اور پامال ایک قبیلہ بن کر رہ گئے۔

''نصیر اس نئی دنیا کا جوان ہے۔ ان کی دانست اور ان کا فہم بھی نئی دنیا کے عالمگیر علم کا ایک حصہ ہے۔ نصیر نے اس پر آشوب دور میں شاعری کا آغاز کیا۔'' رومین رولان'' کہتے ہیں فضا میں ہر جگہ جہاں امید پنپتی ہو شاعر یا فنکار اس کی آواز سن لیتا ہے اور جہاں کوئی درد (Agony) ہو، اسے محسوس کرتا ہے مگر شاعر کا منصب صرف ان امیدوں کی آہٹ سننا یا ان دکھوں کا ادراک نہیں، ان کو بیرونی حقائق سے ملا کر دیکھنے پرکھنے اور منتخب کرنے کا کام بھی شاعر ہی کرتا ہے۔ نصیر اس دور کی امیدوں کا گلاب اور دکھ درد دونوں کے گل کار کرنے والوں میں سے ہیں۔''

سیّد ظہور شاہ ہاشمی کی خدمات

بلوچی زبان و ادب کی ترقی میں انفرادی کوششوں سے جس دوسری شخصیت نے تاریخ ساز خدمات انجام دیں۔ ان میں جناب سید ظہور شاہ ہاشمی کا نام محو نہیں ہو سکے گا۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے وہ ایک جید عالم، عربی، فارسی، اردو، انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی دسترس کے مالک تھے۔

شروع میں اردو، فارسی میں شعر کہتے رہے مگر بعد میں بلوچی زبان کی محبت میں ایسے مبتلا ہوئے کہ بس اسی کے ہو رہے۔ میر گل خان نصیر نے تو صرف شاعری کی، تخلیق کیا، چھپوانے کی خدمت میں ان کے عقیدت مند یا پبلشرز کی کوششیں شامل ہوئیں لیکن سید ہاشمی نے لکھنے، نظر ثانی کرنے، چھپوانے اور لوگوں

تک کتابوں کے (معمولی معاوضہ پر اور کبھی بلا معاوضہ) پہنچانے کا کام بھی اپنے ذمے لیا۔ ۱۹۴۹ء کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر بلوچی زبان کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کو اس مشکل کام میں جن مراحل سے گزرنا پڑا، ان کی اپنی زبانی یہ روداد پیش خدمت ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی کی یاد میں سید ظہور شاہ اکیڈی نے ''برمش'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں جو بروشر شائع کیا۔ منصور بلوچ نے یہ روداد مرتب کر کے بلوچی زبان کے شائقین کو درون خانہ واقعات سے آگاہ کیا۔

''میری والادت گوادر کے مقام پر بارہویں رمضان المبارک ۱۳۴۵ ہجری میں پیر کے دن ہوئی۔ عام طور پر میلادی سال کے ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء مشہور ہے۔ تقابل سے یہ دونوں تاریخیں صحیح قرار پاتی ہیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر سے میں نے شاعری کی ابتدا کی۔ پہلے میں اردو میں کلام موزوں کرتا تھا۔ یہ ۴۰۔۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا۔ گوادر میں اور کوئی شاعر نہ تھا کہ میری اصلاح اور رہنمائی کرتا۔ میرے والد محترم سید محمد شاہ ہاشمی کی فارسی میں خاصی استعداد تھی۔ حافظ، سعدی اور دوسرے فارسی گوشعراء کا کلام انہیں از بر تھا۔ اقبال کا فارسی کلام بھی انہیں بے حد پسند تھا، آپ ایک استاد کی طرح اشعار پڑھتے اور مجھے تشریح کر کے سمجھاتے انہی کی رہنمائی اور درس کا نتیجہ تھا کہ شاعری کی جانب میرا رجحان بڑھتا گیا مگر علم و مطالعہ کی کمی کے باعث اس زمانے میں فارسی میں شعر موزوں نہیں کر سکتا تھا تاہم اردو میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ والد محترم اردو بھی اچھی طرح جانتے تھے مگر میں اپنا کلام انہیں نہیں دکھاتا تھا میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ والد محترم اگر مجھے فارسی شاعری کا ذوق عطا نہ کرتے تو میں ہرگز بھی شاعر نہ ہو سکتا تھا۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ چند ایک کے سوا مجھے اپنی اردو کی غزلیں پسند نہیں آئیں۔ بعد میں فارسی میں بھی کلام موزوں کیا۔

بلوچی شاعری کی ابتدا میں نے ۱۹۵۰ء میں کی۔ میں نہایت افسوس سے کہوں گا کہ اس میں بھی مجھے استاد میسر نہ آ سکا گویا میری بلوچی شاعری میں بھی عطیہ خداوندی ہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک بلوچی کی ترقی کی راہوں سے آشنا کرنے میں اکثر جناب مراد آوارانی سے میری دو بدو گفتگو ہوتی رہی تھی۔ میرے نزدیک جناب مرد آوارانی ان اہل قلم میں سے ہیں جو بلوچی زبان کی زینت بن سکتے ہیں وہ خود ہر چند کہ کمتر ہی شعر موزوں کرتے ہیں مگر ان کے اشعار حسن میں اعلیٰ دست گاہ کے مالک ہیں اور بلوچی نثر میں اعلیٰ پائے کے نثر نگار ہیں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جناب آوارانی سچی بات قول کرنے میں اپنے نفع ونقصان کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

جناب ہوت کا بھی میری شاعری میں بڑا دخل ہے، اس لیے نہیں کہ یہ فن میں نے ہوت سے سیکھا، یا

شعر گوئی میں ان کی پیروی کی، بات اس طرح ہے کہ "ان دنوں جب میں ریڈیو پاکستان کراچی کے شعبہ بلوچی سے وابستہ تھا دوسرے اہل قلم کی طرح کسی تحریر وتقریر یا نظم وغزل کے لیے ان سے رابطہ رکھتا تھا، طریقہ کار کی رو سے ایسی تقریب یا تحریر نشر ہونے کے دن سے دس روز پہلے حاصل کی جاتی ہے مگر میں مہلت کے ان دس دنوں میں روزانہ ہوت صاحب کا مہمان ہوا کرتا تھا۔ اگر میری روزانہ کی یہ حاضری ناغہ ہو جاتی تو نہ تقریر مجھے ہاتھ آتی نہ ہی نشر ہو سکتی تھی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء کے ایک ریڈیو مشاعرے میں دوسرے احباب کے ساتھ میں نے ہوت صاحب کو بھی دعوت دے رکھی تھی۔ ۱۸ دسمبر تک میری آمد ورفت اور ان کی تلاش وجستجو جاری رہی دوسری صبح اچانک میرے ہاتھ لگے ہم دونوں بولٹن مارکیٹ کے ایک چائے خانے میں جا بیٹھے۔ ہوت نے اپنی ایک غزل تھیلے سے نکالی مجھے دور سے دکھا کر جیب میں رکھ لی۔ چائے کا ایک گھونٹ بھر کر بولے "سید! یہ غزل آپ کو تب ہی مل سکے گی کہ آپ خود بھی ایک غزل مشاعرے کے لیے لکھیں۔" میں بہت گھبرایا، مجھے ہوت کے رندانہ ہٹ کا خوب اندازہ تھا۔ میں نے انھیں بہلانے پھسلانے میں کمی نہیں کی مگر وہ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ ہر چند کہ ماضی میں، میں نے اردو میں اشعار موزوں کیے تھے مگر بلوچی میں شاعری کا خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کل مشاعرہ تھا اور دو شعر لکھنا بھی میرے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا مجھے اس بات کا ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ہوت کی یہ ہٹ میری زندگی کے ایک حصے کو یوں متاثر کر جائے گی۔ پورا دن حیص بیص میں گزر ا رات کے دس بجے میں نے کچھ بے سروپا اشعار موزوں کر ہی لیے، غزل کا مطلع کچھ اس طرح تھا۔

ناگمانی چست بنت در کائینت اپا رگ منی
من دپ ءَ داراں نہ بیت دل لہڑ جنیں دارگ منی

بعد میں بلوچی میں مستقلاً شاعری کرنے کے لیے جناب ہوت کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔" جناب ہوت! صرف میں ہی نہیں بلوچی زبان بھی تمہاری احسان مند ہے کہ اس کا بار گراں میرے ان کمزور کندھوں نے سہار لیا ہے۔"

مجھ سے پہلے دوسرے احباب نے بلوچی شاعری کا راستہ اپنالیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کا کلام ریڈیو میں میرے سامنے تھا اور ان سے عموماً نشستیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ اس دور کے بلوچی شعراء کے بارے میں مجھے اور کچھ نہیں کہنا البتہ میں نے محسوس کیا کہ نوآموز شعراء تو رہے ایک طرف کہ جن کو ردیف قافیہ وغیرہ تک کا پتہ نہیں تھا۔ پرانے تجربہ کار شعراء کے کلام میں بھی بلوچی زبان کا حسن وذوق ناپید تھا۔ ان کے کلام میں کثرت سے عربی اور فارسی کے الفاظ بھرے پڑے تھے۔ ان کے قواعد وغیرہ بھی اردو کے

بجائے فارسی کی نقل تھے۔ اردو کی تو بات ہی کیا کہ وہ خود فارسی کی منت پذیر ہے۔ چنانچہ میں نے تگ و دو کر کے ایک حلقہ بنایا تا کہ بلوچی اہل قلم کے لیے ایک ٹھکانہ بن سکے۔ اس ادبی حلقے کے ذریعے یہ سعی کی گئی تھی کہ بلوچی زبان کے لیے ایک رسم الخط بنے اور نظم و نثر میں بیگانے الفاظ کی بجائے خود بلوچی کی اپنی لغت سے کام لیا جائے، ہر چند کہ کام حسب الخواہ نہیں ہوا مگر اس دور کی شاعری کو اگر آج کی شاعری کے مقابل لایا جائے تو ایک خط امتیاز کھینچی جا سکتی ہے۔ اب بھی ہمیں یہی کوشش کرنی چاہیے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتیں، اگر بلوچی کی تنگ دامانی کے باعث ہم کوئی ایسا لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوں تو ہمیں چاہیے اسے فارسی زبان سے مستعار لیں کہ بلوچی، فارسی زبان کی بہن ہے اور اس سے بہت قریب ہے دونوں کے بہت سے الفاظ تقریباً ایک جیسے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں جب میں نے کراچی میں ایک ادبی تنظیم ''بلوچی زبان ء سرچمگ'' کی داغ بیل ڈالی تو بلوچ اہل قلم نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور اکثر اس کے اجلاس ہوتے رہتے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ اس طرح کام نہیں بنتے۔ میں نے اراکین سے درخواست کی کہ کچھ رقم جمع کی جائے تا کہ ''طباعت و اشاعت'' کا ایک باقاعدہ ادارہ کام کرنے لگے مگر کسی نے اس میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

۱۹۵۴ء تک ''سرچمگ'' کے ذخیرے میں نئے اور پرانے شعراء کا کلام، نثری خصوصاً افسانوی مواد جمع ہوا۔ ''سرچمگ'' کے بنیادی مقاصد پر ایک کتابچہ بھی تیار کرایا اور اس کا دستور العمل بھی مگر چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

بلوچی لکھنے پڑھنے کے قواعد بھی بنائے گئے جن پر ''سرچمگ'' کے اراکین اور دوسرے لکھنے والوں نے عمل کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۵۵ء مگسی ہاؤس کراچی میں آغا عبدالکریم خان کی زیر صدارت ایک ادبی نشست ہوئی جس میں کوئٹہ اور قلات کے اہل قلم نے بھی حصہ لیا۔ اس میں میر گل خان نصیر، میر محمد حسین عنقا نے بھرپور حصہ لیا۔ تو اس اجلاس میں میرے بنائے ہوئے الفاظ '' ء۔ ء۔ ء اور یں'' کی منظوری دی گئی۔ دوسرے دن جب ہم مگسی ہاؤس پہنچے تو ان حضرات کے عازم کوئٹہ ہونے کی خبر ملی۔

ان سرگرمیوں کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر سے ''سرچمگ'' کا اجلاس طلب کیا اور دوستوں کو متوجہ کیا کہ خواہ ہم قبول کریں یا نہ کریں ہمیں ''اشاعت طباعت'' کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے میں چاہتا ہوں کہ ہم میں سے ہر رکن دس (۱۰) روپے چندہ جمع کرے تا کہ یہ کام شروع کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چھ اصحاب کو چھوڑ کر دوسروں نے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔ گو ''سرچمگ'' کے اجلاس باقاعدگی سے

ہوتے رہے ''سرچمگ'' کی مالی حالت کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک ''سرچمگ'' کا اثاثہ چونتیس (۳۴) روپوں سے نہیں بڑھ سکا۔ اخراجات کا بار اس پر ڈالنے کے بجائے اجلاسوں میں اپنی گرہ سے میں خرچ کرتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں، میں نے ایک بار پھر ''سرچمگ'' کو منظم کرنا چاہا مگر کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ آخر کار مئی ۱۹۵۴ء میں اپنے خرچ پر میں نے بلوچستان کا دورہ کرنے کا قصد کیا۔

میں کوئٹہ، مستونگ، قلات، پنجگور، تربت، تمپ، مند، دشت، جیونی اور پسنی کے لوگوں کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھ سے ہر طرح سے تعاون کیا۔ مہینوں کے طول وطویل دورے کے بعد جب میں کراچی آیا تو ''سرچمگ'' کا اجلاس بلا کر انتخابات کرائے۔ نئے عہدیدار منتخب ہوئے تو مجھے تعجب ہوا کہ جب ''سرچمگ'' کی گرہ میں کچھ نہ تھا لوگوں نے جھوٹے منہ اس کا پوچھا نہ تھا مگر اب لوگ گرے پڑ رہے تھے۔ میں نے جان لیا کہ یہ ان چند روپوں کا کمال ہے (کاش یہ کوئی بڑی رقم ہوتی) میں چاہتا تھا کہ اشاعت وطباعت کے لیے الگ سے ایک ادارہ بناؤں مگر باہمی مفاہمت مفقود پا کر میں نے بقیہ رقم ''سرچمگ'' کے صدر جناب آزاد جمالدینی کے حوالے کر دی۔

الغرض ''سرچمگ'' کو بنتے بگڑتے میں نے دیکھا، بہر حال میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آزاد جمالدینی کے پاس جو روپے تھے۔ بعد میں انہوں نے اسی رقم سے ماہنامہ ''بلوچی'' کراچی جاری کیا۔ ہم سب جناب آزاد جمالدینی کی ستائش کرتے ہیں کہ انہوں نے عوام کی عطا کردہ رقم سے ایک معیاری رسالہ جاری کرالیا تھا۔ مگر اب ''سرچمگ'' کے ذریعے اشاعت وطباعت کا نام محو ہو چکا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ ماہنامہ ''بلوچی'' اپنے علاوہ کسی طرح کے دوسرے بوجھ کا متحمل نہیں کہ اشاعت وطباعت کی سرگرمیوں کو فروغ دے سکے۔ تو میں نے اہل بلوچستان سے کیے ہوئے وعدوں کا پاس کرتے ہوئے بحرین کا سفر اختیار کیا۔ جہاں میں نے اپنی چھوٹی سی کتاب کی تکمیل کی۔ یہ کتاب ۱۷ مارچ ۱۹۵۶ء میں مکمل تو ہوئی مگر وہاں طباعت کی مایوسی کے بعد میں نے اپنے گہرے دوست جناب بشیر احمد بلوچ کو کراچی خط لکھا تو انہوں نے دست تعاون بڑھانے کی نوید سنائی۔ اس طرح اپنی چھوٹی سی کتاب ''سگیں دستونک'' میں نے ان کی خدمت میں بھیج دی۔ ابھی بشیر احمد بلوچ نے اس کی چھپائی کے لیے اقدام کیا بھی نہ تھا کہ ان کے ایل ایل بی کے امتحانات نے انہیں مصروف کر دیا اور یہ کام ملتوی ہو کر رہ گیا۔ امتحان کے بعد انہوں نے ایک اور دوست کی مدد سے جنہیں اس کام کا تجربہ تھا اس کام کی جانب توجہ دی۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں تپدق کی خوف ناک بیماری مجھ پر بھوکے شیر کی طرح حملہ آور ہوئی۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو مجھے ٹی بی سینی ٹوریم (Sanatorium) میں داخل کیا گیا، ایکسرے وغیرہ کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۷ء میں یہ آپریشن ہوا اور میں ۳ مارچ تک اس کی تکلیف سے نڈھال تھا کہ دوبارہ آپریشن کیا گیا۔ تین مہینوں تک میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہا اس عرصے میں ''سکلیں دستونک'' کی صورت حال سے بے خبر تھا۔

۲۵ اگست ۱۹۵۷ء کے دن میں سینی ٹوریم (Sanatorium) کے تین نمبر بیڈ پر دکھی دل سے الجھ رہا تھا کہ جناب بشیر احمد بلوچ کی جانب سے نقرئی خط ملا اس میں ''سکلیں دستونک'' کے چھپ جانے کی خوشخبری دی گئی تھی۔ چھپائی کے موقع پر بشیر احمد خود کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ ان کا دوست بلوچی نہیں جانتا تھا اس لیے کچھ الفاظ غلط چھپ گئے تھے۔ اغلاط کی کثرت اور غیر ضروری طور پر حروف کی باریکی ایسی نہ تھی کہ نظر انداز کی جاتی چنانچہ میں نے نئے سرے سے اس کی طباعت کا بوجھ اٹھایا۔

دس سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہوا کہ میں بلوچی زبان کے ساتھ مصروف و مشغول ہوں بہت سے بلوچ شعراء اور اہل قلم سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بلوچی زبان نے یہ سال کتنی دشواریوں میں بتائے ہیں۔ بلوچی کی جدید شاعری جو ابتدا میں صحیح راستوں سے ناآشنا بھٹک رہی تھی۔ اب ایک ایسی منزل تک پہنچنے کو ہے کہ اپنی تکمیل کا اعلان کرنے کے قابل ہو۔ مگر ایک بات جس کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ وہ نثر ہے۔ جس کی ترقی کے لیے ریڈیائی تصاویر کے علاوہ کوئی اور کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے لکھنے والوں نے وقتاً فوقتاً جو خطوط سپرد قلم کیے وہ البتہ بلوچی میں شائع کیے گئے ہیں۔

سال ۱۹۶۹ء میں جنوبی ہندوستان (بمبئی) میں تھا جب موسم برسگال کی گھٹاؤں نے ملا فاضل کے کلام کی یاد تازہ کرادی۔ جس میں مون سون کی برساتوں کا ذکر ہے۔ میں اس نظارے سے ابھی لطف اندوز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اچانک تپدق کی بیماری کا ایک اور حملہ ہوا اس موذی مرض کا علاج اچھی خوراک ہے اور خوراک سے اجتناب کی وجہ سے نقاہت اور کمزوری نے مجھے بستر سے لگا دیا۔

اس دوران ڈاکٹر استراسر کے کہلا بھیجنے کے جواب میں، میں اپنے ساتھ بہت سا شعری مواد لایا تھا۔ مگر ان کا پروگرام گفت و برخاستن کے علاوہ کچھ ثابت نہ کرسکا۔ بیماری کے دنوں میں چلنے پھرنے کی ممانعت تھی وقت گزاری کے لیے نظم ونثر کے اس مواد میں مشغولیت رہی تھی۔ اس ذخیرے میں ایک تحریر ''نازکے'' تھی۔ بیس صفحات پر مشتمل یہ افسانہ یا کہانی ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء میں لکھی تھی دس سال کی مدت کے

بعد جب اسے دوبارہ پڑھا تو دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے محبت جاگ اٹھی۔ میں نے اسے مناسب ضخامت دینے کا ارادہ کیا، قلم کے ہاتھ آتے ہی اس کے ابواب میں ترقی ہوتی گئی۔ بعد میں اسے صاف لکھ ڈالا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری محنت رایگاں نہیں گئی۔ دل میں جس صنف کی فنی محبت نے انگڑائی لی تھی اسے کامیابی سے ہمکنار کر لیا تھا۔

ایک آدھ سال کے بعد میں جب کریم دشتی سے ہم نشین تھا یہ مسودہ میں نے کریم کو دکھا کر کہا کہ۔

''یہ نازک ہے۔''

''نازک؟''

کریم نے بے توجہی سے دروازے کی جانب دیکھ کر کہا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ اس بارے میں ان سے قبل ازیں میں ذکر کر چکا ہوں۔ کریم کہنے لگے

''آپ خود اسے پڑھیں میں سن رہا ہوں''

کریم کی اس بات سے میں کچھ مکدر ہوا، معلوم نہیں وہ توجہ سے سنیں گے بھی کہ نہیں، میں نے مجبوراً سرد مہری سے پڑھنا شروع کیا۔

''کریم، سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ ہے کیا؟''

''ناول ہے۔''

کریم نے نیم ترش روئی سے جواب دیا۔

کریم کا یہ جواب میرے اندر کی ضرورت کا اظہار تھا۔ گویا میں نے جس طرح سوچا تھا، یہ ناول ہی ٹھہرا اس لیے کہ کریم اس بارے میں صاحب استعداد ہے۔''

سیّد ظہور شاہ ہاشمی نے شاعری کے بارے میں جو تعریف بیان کی ہے وہ اس طرح ہے:

''شاعری کیا ہے! ہر شخص نے اپنی معلومات اور اپنے احساسات کے مطابق خیال ظاہر کیا ہے اور کر رہا ہے۔ میرا اس بارے میں کہنا کہ شاعری تو شاعری ہے یہ شاعر کی اپنی محسوسات، اپنے علم اور دل سے اٹھنے والے تلخ و شیریں جذبات ہوا کرتے ہیں۔ جنہیں شاعر ترتیب دے کر ہار کی شکل دیتا ہے۔ ہر شاعر اس باب میں اپنے خیالوں کے اظہار میں آزاد ہے۔ میرے نزدیک وہ شاعری نہیں کہلا سکتی جسے شاعر کسی کو خوش کرنے یا کسی کی محبت کے حصول میں کرتا ہو بلکہ فریب کاری ہوگی۔ شاعری کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ہی دل کے حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہو۔''

بلوچی ادب کے بارے میں سیّد ظہور شاہ نے لکھا ہے۔

''ایک ایسی زبان جسے صدیوں کی پائمالیوں نے حرف غلط کی طرح نہیں مٹایا۔ آج وہ انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی ہے۔ بیس برسوں کی مختصر مدت میں بڑا رستہ طے کرلیا ہے۔ اس کی ترقی و ترویج ضروری ہے۔ اس لیے بلوچی ادب کا مستقبل دوسری زندہ زبانوں کے ادب سے مختلف نہیں ہوگا۔''

حسن اور خوبصورتی کے بارے میں سید ہاشمی فرماتے ہیں۔

''حسن کا معیار ہر قوم کیا، ہر شخص کے نزدیک مختلف ہے چنانچہ حسن کے بارے میں میرا نظریہ بھی مختلف ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے احساسات میں سجائے ہوئے حسن بیان سے عاجز ہوں۔ میں کہتا ہوں وہ حسن اور صورت کہ جس کی تعریف الفاظ کے قالب میں سما جائے مکمل حسن نہیں، حسن تعریف کا محتاج نہیں، حسن صرف دیکھنے، محسوس کرنے اور پرستش کرنے کی چیز ہے۔''

سیّد ظہور شاہ ہاشمی کے افکار، تخلیقی جوہر، زبان سے محبت کی تفصیل قلم بند کرنے کے لیے کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہوگی۔ وہ کلاسیکی دور کے شعراء، جدید شعراء، اساتذہ ادب اور نوآموز شعراء ہر ایک کے نزدیک قابل احترام اور قابل تقلید رہے ہیں۔ اس میں بلکل بھی شک نہیں کہ انہوں نے شعرو ادب میں جن خطوط و نکات کے ذریعے رہنمائی کی تھی۔ آج لکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ اس کی پیروی کر رہا ہے اور آنے والے ہر دور میں بلوچی ادب پر سیّد ظہور ہاشمی کی چھاپ ہوگی۔

بشیر بیدار جو ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ سیّد ہاشمی کے بارے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں۔

''سیّد ہاشمی نے بلوچی زبان و ادب کے لیے بہت زحمت اٹھائی ہے۔ ان کا مقصد زبان کی ترقی و ترویج رہا انہوں نے زبان کے نقصان کا ہرگز بھی نہیں سوچا ہوگا۔ سیّد کی موت کے بعد ان کی خدمات پر نقد و تبصرہ اب کینہ جوئی یا ریاکاری سے پاک ہوگا۔''

صبا دشتیاری نے سیّد ظہور شاہ ہاشمی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے پابند شاعری کے علاوہ آزاد شاعری کے نمونے بھی دیے ہیں ایک ایسا نمونہ ذیل درج ہے۔

کلام (ترجمہ)

بے حمیتی سے جھلس جانا بے نتیجہ ہے
پوری طرح بھسم ہوتے کہ تمہاری راکھ سرمہ ہے
دشت کے گرمی کی لہروں نے جھاڑ دیے تھے

زرخیز کھیتوں پر بکھیر دیتے
شان سے ٹوٹے ہوئے ہر ڈھیلے کی تہہ میں
نئی زندگی کی نئی نوبتیں انگڑائی لے کر اٹھتیں
ہمیشہ کے لیے بھولے ہوئے قرض اور انتقام کے بجائے
بدترین دشمنوں پر حملہ آور ہوتے
چنگل شیرانہ کی شان کا تقاضہ ہے
پروانہیں نسل کشی اور دیار سوزی کرتے
اس سے تمہارے داغ دھل کر رہ جاتے
بے حمیتی کی زندگی کو آگ میں جھونک دے
خوب جل اور خوب جلا کہ
جھلس جانا بے حمیتی کا بے نتیجہ انجام ہے

سید ظہور شاہ ہاشمی کو بلوچی کے مشہور شاعر جناب اشرف سربازی نے "سید الشعراء" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سید!
تم، "سید الشعراء" ــــــ دانشوروں کے رہبر
ایک ناز اور انداز سے مشاطگی کی تو نے
مادری زبان کی نازوں پلی دلہن کی
پھول ٹانکے اس کی گیسوؤں میں
موتی جیسے اشعار سے
بلوچی! ــــــ تیرے ہاتھوں جی اٹھی
بلوچی کو ــــــ تو نے ہمسر عرش کر دیا
تیری موت سے ــــــ!!!
میں ہی نہیں! ــــــ غموں سے نڈھال، بردبار و بیزار
تیرے تمام دوست اور ساتھی

خوش پوش رفقا کی مجلسیں۔۔۔۔۔اور
وہ شاہانہ نشستیں
سب سوگوار ہیں۔۔۔۔۔بہتے ہوئے آنسوؤں۔۔۔۔۔کی پناہ میں
دوستو بے شک خدا کی ذات کا وجود ہے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا نام ہے۔
مگر کون سا رحمٰن۔۔۔۔۔اور کیسا رحیم؟
یہ کیسا رحم ہے رحمٰن قادر نے۔
کہ اک مشہور نام اور۔۔۔۔۔معاشرے سے، قوم سے۔
اک ایسا گوہر نایاب، قدآور۔۔۔۔۔کو چھینا ہے۔
ابھی تک عمر ایسی تو نہ تھی ان کی۔۔۔۔۔کہ عزرائیل۔
آ کر اس کا پیچھا کر کے۔۔۔۔۔چھینے اور لے جائے۔
سیّد!
اک عام سا انساں نہ تھا۔۔۔۔۔عزرائیل۔
جب چاہے جہاں چاہے۔
تو اپنے تشنہ اور پرخوف، نوکیلے نیش عقرب
بھونک ڈالے
وہ بھی ظہور شاہ کے نازوں پلے دل اور گردن میں
ہزار افسوس کہ۔۔۔۔۔میں بھی اور تو بھی دیکھتے رہ گئے
ظہور شاہ گرچہ ہم سے موت نے چھینا
مگر نام، ان کا ہمیشہ زندہ جاوداں، ہمیشہ جاوداں ہے، جاوداں رہے گا۔
سیّد ظہور شاہ ہاشمی نے اردو، بلوچی میں لاتعداد کتابیں، مضامین اور مقالے سپرد قلم کیے مگر "سیّد گنج" بلوچی لغت ان کی وہ علمی ادبی اور تاریخی خدمت ہے جو رہتی دنیا تک ان کی اس قابل قدر خدمت کی یاد دلاتی رہے گی۔ اس کی طباعت سیّد ہاشمی اکیڈمی، کراچی نے کی ہے۔ سیّد کی دوسری طبع شدہ کتب درج ذیل ہیں۔

شتلیں دستونک	شاعری	بلوچی
بلوچی زبان وادب کی تاریخ	تحقیق	اردو
جزءعم	پارہ عم کا ترجمہ	بلوچی
انگرو ترونگل	شاعری	بلوچی
برتلکیں بیر	شاعری	بلوچی
ترامپ کنیں ترمپ	شاعری	بلوچی
بلوچی سیاہگ راست نبیگ	قواعد زبان	بلوچی
شکلیں قجو	شاعری	بلوچی
چکانیں	شاعری	بلوچی
سیدنمدی	خطوط	بلوچی
سید گنج	بلوچی لغت	بلوچی
نازک	ناول	بلوچی

اصنافِ ادب

شاعری

حکما نے کہا ہے شاعری ایک روشنی ہوتی ہے اور اس روشنی کو گھر مہیا کرنا شاعر کا کام ہوتا ہے۔ اس روشنی میں شاعر کا احساس، اس کا جذبہ اور اس جذبے کو موسیقی میں ڈھالنے کی قوت کارفرما ہو لیکن خیال اور احساس کی وحدت اس کی جگمگاہٹ میں مضمر ہے۔" بلوچی شاعری کا جب ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے گا تو یہ ان تمام پیمانوں پر پوری اترتی ہے جو اس صنف کی خصوصیات ہیں۔ خود بلوچی شاعری کا تحریر کے پردے میں محفوظ نہ ہونا، صدیوں تک اس کی بقا اور اس کی جگمگاہٹ، زندگی کے گوشوں کو منور کرنے کی اہلیت، موسیقی میں ڈھلنے اور رچ بس جانے کی صلاحیت کسی معجزے سے کم نہیں۔ بلوچی شاعری میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ترقی پسند یا ترقی یافتہ زبانوں میں وجہ افتخار ہیں۔ اس میں روانی ہے معنی آفرینی ہے، جذبوں کی صداقت اور عشق و معرفت کی سرفرازی ہے۔ یہ تاریخ کی امین اور تمدن کی ترجمان ہے۔ دل آویزی، نزاکت، حسن تخیل غرض اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن پر کوئی بھی ایک زبان فخر کرسکتی ہے۔

شاعر کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ شاعر اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بلوچی شاعری اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ بلوچ معاشرہ آج نہیں بلکہ صدیوں سے اوصاف حمیدہ سے متوصف رہا ہے۔ بلوچی شاعری میں ایسے دو ایک نہیں سینکڑوں حوالے ملتے ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ جس قوم کی یہ شاعری ہے وہ شجاعت، حمیت، صداقت و محبت میں یگانہ، مہمان نوازی، پناہ دہی، جرات میں بے مثال، حسن پرستی، نازک خیالی میں لاجواب ہے اور اس کا تہذیب و شائستگی میں اعلیٰ ترین کردار رہا ہے۔ اس دور کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اشعار میں ملتی ہے۔

گزرے دنوں کی بات ہے
صدیوں کی یہ سوغات ہے
اپنا وطن آباد تھا
آزاد تھا اور شاد تھا
گلرخ حسینوں کی ادا
حوروں سے تھی بڑھ کر سوا
صورت پہ لالہ کا گماں
قد سرو ساں رخ بوستاں
بندہ نہ ہو آقا نہ ہو
مظلومیت کا کیا مداد
بھائی تھے سب خوار وامیر
اک دوسرے کے دستگیر!
آزاد، شاد اور متحد
مردانگی میں مستعد
کہسار تھے ان کے حصار
برادر دو دھارا ذوالفقار
ان کے نگہبان تھے سپر
خنجر انہیں مثل پسر
تنہا تھا بھاری ہر سپاہ
ہر شخص تھا جرات پناہ

بلوچی شاعری ہر دور میں اپنی بہترین خصوصیات کے باعث مقبول رہی ہے۔ اس کی اسی مقبولیت نے اسے صدیوں تک سینوں کی امانت بنائے رکھا۔ فطرت سے اس کی قربت نے اسے دلوں میں جاگزین کیا، محبت کی لافانی قوت نے اسے پروان چڑھایا اور اگر وقت نظر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ بلوچی زبان کی اسی عہد آثار شاعری کی یہ کرامت ہے کہ اس نے صدیوں پہلے عدم میں جا کر سونے والے شاعروں کو زندہ رکھا۔ ان کے بیان کیے ہوئے ہیروؤں کو باقی رکھا۔ ایک مثالی معاشرے کی قدروں

کو غلط ملط نہ ہونے دیا۔تہذیب اور شائستگی کے چراغ اسی کرامت کے باعث روشن ہیں اور رہتی دنیا تک روشن رہیں گے۔جدید ادب اسی کی خوشہ چینیوں میں مصروف ہے۔

بلوچی شاعری کے دور جدید کا تعین نہیں ہو سکتا اگر ادوار گزشتہ کی شاعری کا ادراک نہ ہو،اس لیے کہ مختلف ادوار کی بلوچی شاعری کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملتے آئے ہیں۔ان کی جڑیں باہم گر پیوست ہیں۔عطا شاد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

''ہم اگر اپنی شاعری کی ابتدا دیکھیں کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہمارے ہاتھ لگا ہے وہ خواہ میر جلال خان کے زمانے کی ہو یا چاکر، گہرام،حانی شئے مرید،بی برگ گراناز،جام درک،ملا فاضل،ہر دور کی شاعری ایک خاص انداز ادا سے اپنے بعد کی آنے والی شاعری کا پتہ دیتی ہے۔

بلوچی شاعری کے تین بڑے دور ہیں میر گل خان نصیر کے خیال میں یہ چار ادوار میں منقسم ہے۔ہر ایک دور اپنے آخر میں آنے والے دور سے مل جاتا ہے۔تیرہویں صدی کے آخری دو عشروں سے اٹھارویں صدی تک ایک طویل دور ملتا ہے جس میں بلوچی شاعری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔اسی میں ''رند اا شار'' کی معرکہ آرائیاں ہیں۔اسی میں ''بی برگ'' کی حسن سے بزم آرائیاں ہیں۔یہیں ''حانی اور شئے مرید'' کی محبت افتاد کا شکار ہوتی ہے مگر دو دہائیوں کا دور ابھی اپنے جاہ وجلال پر ہے کہ دور ثانی کے ابتدائی زمانے کے شعراء سے مدبھیڑ ہو جاتی ہے اور جام درک سے جدید تک کئی ایک پرانے شعراء کلاسیکی ادوار کے باقیات تھے ان میں ملا اسماعیل پھل آبادی،نصیر کہدانی،میر عیسیٰ قومی اور جوانسال کی قدامت کی زندہ تصویر بنے رہے۔جوانسال کا ۱۹۶۹ء میں انتقال ہوا نصیر کہدانی ۱۹۸۹ء میں وفات پا گئے اور میر عیسیٰ قومی نے ۱۹۹۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔اس مرحلے پر بلوچی جدید شاعری اپنے پورے شباب پر تھی اور ہے۔

بلوچی جدید شاعری کا دورانیہ اگرچہ پچاس سالوں کے لگ بھگ ہے مگر اس دور میں مجموعی طور پر گزشتہ دو ادوار سے بھی زیادہ شاعر اپنی زبان میں سخنوری کی محفل سجائے ہوئے ہیں۔ان شعراء کے اگر صرف نام ہی لیے جائیں تو اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب تو کیا،اوراق بھی کم پڑ جائیں گے اس لیے اس جائزے میں کوشش کی جائے گی کہ اساتذہ،نمائندہ اور نو وارد شعراء کا اس طرح تعارف پیش کیا جائے کہ جدید شاعری پر ان کے اثرات محو نہ ہونے پائیں تاہم اگر شعراء کی طول وطویل فہرست میں کوئی نام رہ جائے تو اسے قصداً نظر انداز کرنے کا الزام نہ دیا جائے کہ یہ جائزہ بہت ہی کم وقت میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

قدیم شاعری کا اثاثہ

بلوچستان اور کراچی میں یا بیرون پاکستان جتنے بھی ادبی ادارے بلوچی زبان کے لیے کام کر رہے ہیں ماسوائے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے اور کسی ادارے نے بھی قدیم بلوچی شاعری یا ماضی کے ادبی اثاثے کی تلاش، تحقیق، جمع آوری اور تحفظ کی طرف توجہ نہیں دی۔ تقریباً سارے ہی ادبی ادارے جدید ادب کی مشاطہ گیری میں مصروف ہیں۔ تاہم بلوچی اکیڈمی نے گزرے ہوئے چونتیس برسوں میں قابل لحاظ مقدار میں قدیم شاعری، لوک گیت، لوک کہانیاں اور داستانیں، ضرب الامثال وغیرہ بعد تحقیق فراہم کر کے کتابی صورتوں میں محفوظ کیا ہے جو مستقبل میں بلوچی زبان و ادب پر تحقیق کے کام میں یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ ایسی ہی تالیفات اور ان کے مؤلفین کا مختصر ساذکر کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔

بشیر احمد بلوچ نے اس کام کا آغاز سب سے پہلے اٹھارویں صدی کے اہم شعراء جام درک کا کلام ''درچین'' میں اور ملا فاضل کا کلام ''شپ چراگ'' میں مع ان کے معلوم حالات کے شائع کرائے ''لال ءُ گرانا ز'' بلوچی لوک داستان کی تلاش اور ملا قاسم کے کلام کو یک جا کر کے ''پھلیں اشرفی'' کے نام سے بھی آپ نے پیش کیا۔

''توکلی مست'' اور ''رحم علی کا کلام میر مٹھا خان مری کی شبانہ روز کوششوں سے جمع ہو سکا۔ قدیم شاعری کی فراہمی اور تحقیق میں جناب یوسف نسکندی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ''رنگیں لال نمبر تین'' میں ماضی کے گم گشتہ اوراق دریافت کرنے کے علاوہ دو اہم شاعروں حسن زرگر کیچی کو ''گوناپ'' میں اور ملک دینار میر واڑی کی شاعری کو ''زری نود'' میں سمیٹ کر حد درجہ قابل ذکر ادبی خدمت کی ہے ''رنگیں لال نمبرا'' غوث بخش صابر نے ''رنگیں لال نمبر۲'' پیر محمد زبیرانی نے ''رنگیں لال نمبر۴'' ''رنگیں لال نمبر۵'' حاجی محمود مومن بزدار اور اسحاق ساجد بزدار نے دست بردز مانہ سے بچا کر بلوچی ادب کے اثاثے میں اضافہ کیا جب کہ عطا شاد صاحب نے لوک گیتوں کی کتاب ''درین'' میں نہ صرف لوک گیت جمع کیے بلکہ جناب عین سلام کی مدد سے ان کا منظوم ترجمہ بھی کر دیا جو غیر بلوچ

ادب کے شائقین کے لیے قیمتی تحفہ ہے۔عطا شاد اور میر گلزار خان مری نے جوانسال گِکی کا کلام الگ الگ جلدوں میں شائع کر کے کلاسیکی دور کے اس مقبول شاعر کی مقبولیت بڑھادی۔

چاکھا بزدار کا کلام مومن بزدار اور فیصل فقیر کا کلام گلشن اشعار میں پیر محمد زبیرانی کی محبتوں کا عطیہ ہے۔''عمران شیئر'' اشرف سربازی اور میر عبدالکریم ساجدی کا کلام'' شاشان'' میں رزاق نادر نے سمینا ہے۔میر عبداللہ جان جمالدینی نے شیر جان کی حیات اور کلام کی فراہمی میں نہایت عرق ریزی کی ہے۔ ''بلوچی قدیم شاعری'' میں عہد رفتہ کے نامور شعراء کا کلام اور اس دور کے واقعات کو میر شیر محمد مری نے قلم بند کیا''بلوچی ثقافت کے گیتوں میں عبدالقادر اشیر شاہوانی نے متعارف کرایا ہے۔''دستانغ''بلوچی لوک گیتوں کی ایک صنف ہے اس نام سے غوث بخش صابر نے بچے کی دھن پر گائے جانے والے گیتوں کو جمع کر کے شائع کرایا ہے۔

ماضی میں چند بلوچ شعراء گزرے ہیں جنہوں نے فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ان میں گل محمد ناطق (جو مرزا غالب کے ہمعصر تھے) کی کتاب''جوہر معظم'' اور حلیم اللہ حلیم کا دیوان، میر طاہر محمد خان مرزا کی تلاش و تحقیق کے نتیجے میں ہاتھ آیا جبکہ علامہ قاضی نور محمد گنج آبادی کا کلام''تحفۃ النصیر'' کے نام سے بلوچستان یونیورسٹی کے ذریعے آغا میر گل خان نصیر نے طباعت سے آراستہ کرایا۔میر محمد سردار نے مست توکلی پر''سرمست بلوچستان'' لکھی اور رسانی وشتے مرید کے کلام کو غوث بخش صابر نے لوک ورثہ کے لیے اردو میں منظوم کیا۔

یہ ان قدیم شعراء کے کلام کا ایک مختصر سا جائزہ تھا جو محفوظ ہو کر مستقبل میں بلوچی ادب پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا باعث ہوگا۔

بلوچی کے جدید شعراء

اساتذہ

گذشتہ پچاس سالوں کے عرصے میں بلوچی میں جتنے شعراء کے نام ملتے ہیں وہ مجموعی طور پر گذشتہ ادوار کے شعراء پر بلحاظ تعداد بھاری ہیں۔اس کے اسباب سے بحث کرنے میں ایک واحد نکتہ جو سمجھ میں آتا ہے بلوچ قوم اور بلوچستان کی وہ محرومیاں ہیں جو آزادی کے بعد معاشرتی ،اقتصادی، تعلیمی ترقی سے اغماض کے باعث لوگوں کے دلوں میں مایوسی، بے دلی، غم وغصہ کے جذبات بڑھانے کا سبب بنتی ہیں۔روشنی کے اس دور میں بلوچستان کے خطے میں کتنے ہی ایسے شہر وقریہ ہیں جو تاریکیوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ترقی کی اس گہما گہمی میں بلوچستان کے باسی پینے کے پانی تک کے لیے ترستے ہیں۔ اسکولوں کی عمارتیں موجود ہیں مگر تعلیم ناپید، مساوات کے نعرے گونج رہے ہیں مگر برابری کے لیے کسی طرح کی مخلصانہ پیش قدمی نہیں، سیاست آج ماضی کے مقابلے میں بہت آزاد ہے ورنہ سیاست کے نام لیواؤں نے سیاسی رہنماؤں، کارکنوں کو جس طرح تختہ مشق بنایا وہ ہماری تاریخ کا ایک لرزادینے والا باب ہے۔پھر ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے غلط قسم کے عناصر کی باتوں میں آکر بلوچستان میں اپنے ہی بھائیوں کو طاقت کے بل بوتے پر روندھا، دارورسن کے جیسا بازار گرم کیا، ان سب باتوں نے دلوں میں غبار بھر ڈالا۔اس غبار کو، مایوسی کے اس ردعمل کو ناانصافیوں کے اس نتیجے کو شعروں کا روپ ملا، کچھ نے رمز کا سہارا لیا، کچھ نے برملا اظہار کیا مشکل ہی سے کوئی ایک بلوچی شاعر ایسا ہوگا جس نے غم جاناں کو غم دوراں کے پردے میں نہ دیکھا ہو۔اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ وہی شعر اور وہی شاعر عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر رہ گئے۔جن کے شعروں نے قید کے دوران جنم لیا۔میر گل خان نصیر نے جتنے اشعار جیلوں اور زندانوں میں رہ کر موزوں کیے اتنے آزاد فضا میں نہیں کیے ہوں گے۔

محمد حسین عنقا کی شاعری بائیس برسوں تک کراچی، ہری پور، منٹگمری، مچھ اور حیدر آباد کی جیلوں میں پل

کر ہوان ہوئی، آزاد جمالدینی، اکبر بارکزئی، مراد ساحر، سیّد ظہور شاہ، ہر ایک نے تلخی ء دوراں کے ذائقے چکھے۔ یہ سارے تجربات غم کے لمحات، زخم زخم احساسات شاعری کا سرمایہ بن کر جدید بلوچی ادب کو تحفے میں ملے اس لیے جب ہم بلوچی شاعری کے دور جدید میں آغاز پر پہلی نظر ڈالتے ہیں تو معاصرین کی شاعری کے برخلاف اس میں حسن و عشق کی وارداتوں، گل و بلبل، شراب و شباب کی دکایتوں کی جگہ دلگداز نعرے اور دلدوز چیخ و پکار سنتے ہیں۔

میر گل خان نصیر جن کا پہلا مجموعہ کلام ''گلبانگ'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں چھپا تھا وہ یکسر ان ترغیبات کا مجموعہ ہے۔ میر گل خان نصیر کلام کا ترجمہ دیکھئے:

کلام (ترجمہ)

وہ دل جس میں ذرا بھی جرآت مردانگی ہے
وہ دل جس میں ذرا بھی قوم کا درد ہے
وہ دل جس میں ذرا بھی ملک کے لیے امنگ ہے
وہ الجھتی ہوئی دھند میں بھی متوجہ ہے
وہ دل با اشبہ غم و غصہ میں مبتلا ہے
وہ دل یقیناً پریشان اور حیران ہے

اس پہلی نظم میں جبر، استحصال، ظلم اور ناانصافی کے خلاف شدید ترین احتجاج ہے اور یہ ختم نہ ہونے والا احتجاج آج بھی بلوچی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے بھی انگریز مشنری سرگرمیوں کے جواب میں مولانا حضور بخش جتوئی اور مکتبہ درخان کے دوسرے شعراء نے اسلام کی صداقت، قرآنی تعلیمات اور عشق رسول ﷺ کو شاعری کا عنوان بنایا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ مگر وہ ہمارے دائرے میں اس لیے نہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے ظہور پذیر ہوا تھا۔ مولانا حضور بخش جتوئی خود بھی ۱۹۴۶ء میں انتقال کر گئے تھے۔ جدید بلوچی شاعری کی ابتدا میر گل خان نصیر سے ہوتی ہے اور ''گلبانگ'' ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کا طبع اول دستیاب نہیں طبع ثانی میں دیباچہ اس بات پر روشنی نہیں ڈال سکتا کہ نصیر کا یہ کلام کس زمانے کا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس کا پہلا ایڈیشن چھپا ہے ضرور اس میں دو تین سال پہلے کا کلام یک جا کیا گیا ہوگا، اس سے بھی بڑھ کر ایک اور اشارہ ''داستان نوشکی'' نظم ہے یہ نظم ۱۹۴۶ء غربا تحریک اور انگریزوں کے خلاف نوشکی کے عوام کا ایجی ٹیشن ہے۔ اس سے پہلے جدید شاعری پر کسی طرح کا مواد دستیاب نہیں۔

بلوچی شعراء

میر گل خان نصیر

میر گل خان نصیر نے اپنے ایک انٹرویو میں بلوچی شاعری کے آغاز کے واقع پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔
''ہم کچھ دوست ۱۹۲۴ء سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے آرہے تھے اسی کی بناء پر بعد میں سابق ریاست قلات میں ہم سے چند ایک کو ملازمتوں کو حقارت سے ٹھکرانا پڑا تھا، ایک وقت ایسا آیا جب ہمارے کئی ایک ساتھیوں کو انگریزوں کے ایما پر ریاست بدر کر دیا گیا۔ اس اقدام کے خلاف احتجاجی جلسے لاہور، پشاور، اجمیر شریف اور دہلی وغیرہ میں بھی ہوئے پشاور میں سرخ پوشوں کی مدد سے ایک ایسے ہی احتجاجی جلسے میں، میں بھی شریک تھا۔ جلسے میں تقاریر کے ساتھ ساتھ شعراء نے اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں کلام سنایا میں ان دنوں فارسی، اردو میں شاعری کرتا تھا مجھے اس پر بڑی خفت محسوس ہوئی کہ بلوچی زبان میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اس دن کے بعد سے میں دوسری زبانوں میں شاعری ترک کر دی حتیٰ کہ براہوئی میں بھی ''مشبد نا جنگ نامہ'' کے بعد میں نے شعر نہیں لکھے۔ میری شاعری کا تمام اثاثہ مادر وطن کی دین ہے۔
میر گل خان نصیر کے ''گلبانگ''، ''شپ گروک''، ''دوستین شرین''، ''حمل جیئند کلمتی''، ''گرند''، ''پرنگ''، ''گل گال''، ''ہون ءِ گوانک'' سات مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ امکان ہے کہ ان کا غیر مطبوعہ کلام اب تک بھی منتظر اشاعت ہو۔ شروع میں انہوں نے عوام کے ذہنی سطح کے خیال سے اپنے اظہار کو نہایت سادہ و رواں رکھا اس پر انہیں کچھ حلقوں سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا مگر ''شپ گروک'' میں انہوں نے کچھ شاہکار نظمیں کہہ کر مخالفین کو اپنا معترف بنایا۔ عوام نے انہیں ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ اس میں شک نہیں کہ میر گل خان نصیر کو سیاست کے حوالے سے طویل قید و بند کے مراحل پیش آئے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال نے ان کے شاعرانہ احساس کو جھنجھوڑا، ہجر و فراق کی حالتوں نے اس پر اثر کیا جس سے ان کی شاعری میں پختگی آتی گئی اور پھر وہ دن بھی آیا

جب وہ عوام کے ترجمان اور ان کے دل کی دھڑکن بن کر رہ گئے۔ آپ کا ۱۹۸۳ء میں انتقال ہوا۔

کلام

بلوچی	اردو ترجمہ
بالاں بی سکہ لالا انی	فروزاں رہ دلرباؤں کی صورت جیسی
گلیں ڈیوا شالالانی	دیئے تیری لَو اونچی رہے
تئیہ شپ تہار ماہ انت	ابھی تک تاریکی شب باقی ہے
دو دیمی ہنکل و ذاہ انت	دو طرفہ چیخ و پکار، للکار باقی ہے
در ء دور ء مُج و سیاہ انت	در کے سامنے دور تک دھند کی چادر تنی ہے
نہ منزل پاش نے راہ انت	نہ منزل کا نشان نہ راستے کا پتہ
سیاہی پہ گُل ء داب انت	تاریکی اپنے عروج پر ہے
کنڈی لوگے ء دپ ء تاب انت	گھروں کے دروازہ پر زنجیر چڑھی ہوئی ہے
کچک ء انی گپ و گاب انت	کتوں کے بھونکنے کا شور ہے
کروس مُن منہ ء واب انت	مرغ سحر کسی کونے میں محوخواب ہے
پلیتانی بدل گجاں!!	تیرے پلیتے کی جگہ میں
دل ء بنداں کناں رت ماں	دل کے ریشے ڈال دوں
ترانیل ء بدل گجاں	تیل کے بجائے اپنا خون
وتی ارس و دل ء ہوناں	اور اپنے آنسو بھر دوں
برے تاریکی ء ایوک	اس لیے کہ اس تاریکی میں صرف
تئی نور ء انت مئے دل سک	تیرے نور سے ہمارے دلوں کو تقویت ہے
تئی گردچ بنت یک یک	تیرے اردگرد ایک ایک کر کے جمع ہیں
کنوک شیدائیں درہیں تک	تیرے دیوانے اور تیرے شیدا قبیلے
بلاں بی سکہ لالانی	فروزاں وہ دلرباؤں کی صورت جیسی
گلیں ڈیوا شالالانی	دیئے تیری لَو اونچی رہے

سیّد ظہور شاہ ہاشمی

آپ گوادر کے باسی تھے گوادر ۱۹۵۸ء سے پہلے سلطان مسقط کے زیر تسلط تھا سید ہاشمی کو اغیار کی حکمرانی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔انہوں نے فہم و شعور کے چشموں کو کرید نا چاہا۔لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوششیں کیں ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا جسے وہ ہاتھ سے نقل کر کے لفافوں میں بند کر کے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔سی آئی ڈی والے چوکس ہوئے انہیں گوادر بدر کیا گیا وہ کراچی آئے ریڈیو پاکستان کراچی میں جن دنوں بلوچی پروگراموں کا آغاز ہوا بلوچی پروگرام سے وابستہ ہوئے، ریڈیو پروگراموں کا اہتمام کرتے تھے مگر خود فارسی اردو میں شاعری کرتے تھے بلوچی کے ایک شاعر قاسم ہوت کے اصرار پر انہوں نے بلوچی میں شاعری کی جانب توجہ کی۔وہ بلوچی زبان میں اصلاح کے بہت بڑے مدعی اور مصلح تھے زبان کو الفاظ کے خزینے بخشے،شعر گوئی میں بھی ان کا کمال غیر متنازعہ ہے،غزل، نظم دونوں پر ان کی دسترس مسلم تھی بلوچی نثر میں انشائیہ کے بانی تھے،افسانے لکھے،ناول لکھے،لغت ایسی مرتب کی ہے کہ اس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔شاعری کے پانچ مجموعہ مرتب کیے۔آپ کی پہلی کتاب ''سکیں دستونک'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی بعد میں ''انگر و تر ونگل''،''برتکلیں بیر''،''ترامپ کنیں ترمپ''،''سچکانیں سسا''،''شکلیں شہجو'' کے نام سے شعری مجموعے آتے رہے۔سید ہاشمی اکیڈمی ان کی یاد میں قائم ہے۔سید ہاشمی پر سخت ذہنی اور جسمانی محنت کی وجہ سے تپدق کا حملہ ہوا۔کئی سال تک اس موذی مرض سے نبرد آزمارہ کر بھی وہ زبان کی خدمت میں مصروف رہے۔۔۴ مارچ ۱۹۷۸ء کی صبح انتقال کیا۔

کلام

بلوچی	اردو ترجمہ
بیا پدا شکمیں تاارانی دل ،دراں کنیں	آؤ پھر سے سنگین چٹانوں کے سینے چیر ڈالیں
گراں بہائیں دوستی و مہر ءَ پدا ارزاں کنیں	آؤ انمول محبت اور دوستی کو پھر سے ارزاں کر دیں
تئی دو ئیں گالاں منی ناسر پدیں دل گو نجتگ	تمہارے دو لفظوں نے میرے انجان دل کو چھوٹا ہے

بیا پداگاالانی ربالو زری نوداں کنیں
ماراچہ راہ ء گرہ کرتگ اے بیرا ہیں سراں!
اے دل ءُ ہوتاں چہ سبریں مادنیں رنداں کنیں
نوں دل ءُ ہمنگریں کہ جوانیں رودچ چماں اندرانت
زاں پہ زاں نندیں جگمر بریں گماں تالاں کنیں
مان تر انت ھانل ماہ گل اگاں دیم ءُ مئے
منتاں اش زوریں بندیگش وتی قولاں کنیں
دورنہ انت منزل ہزار گنج ہزار نازیں سید
ھمبلاں زوریں پہ کورے دور سریں رمباں کنیں

آؤ ایسی باتوں کے لیے سمندر کی ہواؤں کو قاصد بنائیں
ان راہ گم کردہ رہنماؤں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا ہے
اس دل کے خون سے سرخ نشان راہ بنائیں
اب دل کو اطمینان دلاؤ کہ بھلے دن دور نہیں
جب وصل میں ہم بیٹھ کر دکھ بانٹیں گے
ہماری محبوبائیں ہانل اور ماہ گل اگر راہ روکنے آئیں
شکریے کے ساتھ انہیں عہد و پیمان کے قیدی بنائیں
اب سید نازدفتوں والی منزل دور نہیں ہے
ساتھیوں کو ساتھ لیے پرسیل ندی کی طرح بڑھتے رہیں

میر محمد حسین عنقا

میر گل خان نصیر کی طرح ان کا تعلق بھی سیاست سے نہایت گہرا ہے۔تحریک آزادی کے دوران سرکاری ملازمت سے دست بردار ہوئے۔''انجمن اتحاد بلوچستان'' اور ''انجمن وطن'' میں رہے جب ان سیاسی تنظیموں کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو آپ نے کراچی کا رخ کیا۔وہاں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں کئی ایک اخبار نکالے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے رہے۔سیاسی سرگرمیوں میں پر جوش حصہ لینے اور حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والوں میں آپ کی آواز سب سے بلند تھی مجموعی طور پر بائیس سال تک مختلف جیلوں میں محبوس رہے۔آپ نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ''رحیل کوہ'' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں اردو فارسی میں شائع کیا۔۱۹۵۰ء میں بلوچی شاعری کی جانب راغب ہوئے۔کلام زیادہ تر سیاسی نظریات سے قریب مگر شاعرانہ طرز ادا کا حامل ہے۔مشرقی اور مغربی بلوچی لہجوں کو قریب تر لانے کی کوششوں کے باعث زبان عام لوگوں کے لیے غیر مانوس نظر آتی ہے۔مگر معنویت سے بھرپور،غزل اور نظم دونوں پر قدرت ہے۔میر محمد حسین عنقا کا کلام ''توار'' کے نام سے آزاد جمالدینی اکیڈمی نے شائع کیا۔اس کتاب کو بھی حال ہی میں اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔

کلام

بلوچی	اردو ترجمہ
چہ درستیں گل زمین جواں منی بلوچی ئیں وطن	ساری دھرتی سے منتخب میرا بلوچی وطن ہے
ہے زمیں منی، ہمیشی برزیں آزماں منی	اس کی زمین میری، اس کا اونچا آسمان میرا ہے
ہے زمین و آزمان ءِ ہر چی درمیاں منی	اس زمین اور آسمان کے بیچ جو کچھ ہے میرا ہے
ہمیشی جھیرہ و صلاح ہمیشی سیت وزیاں منی	اس کے تنازعات اس کے سود وزیاں سب میرے ہیں
مناں دوست چوں وچہ درستیں گل زمین وطن	مجھے کیوں اس سے محبت نہ ہو ساری دھرتی سے منتخب میرا بلوچی وطن ہے
جہاں دراہ ارش کناں گنوک تئی پہ چارگ ءَ	ساری دنیا ہجوم کرکے اسے دیکھنے آرہی ہے
سپیت وسیہ رگام گوں بہشت ءِ شیر و بینگ ءَ	صبح درخشاں اور سہانی شام، بہشت کا دودھ اور شہد لیے

گوں آئمی نمیں، دیدگ، گوں نازبوئیں نیلگاں — گلوں کی خوشبو اور چشم سیہ کی ستی لیے

کناں سپت، مدام گوشاں کہ نے چہ تو گہیں وطن — میں اس کی تعریف میں رطب اللسان کہ اس سے اچھا وطن اور نہیں ہے

چہ سندھ تئی پی چارگ، گشاں سسی سرا — سندھ سے اس کی سیر کے لیے سسی دوپٹے میں ملبوس

چی قندہار سے گرانگ انت بیل تئی پہ خاطرا — قندھار سے گراناز اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

زمین و جنت، کہ وش کنئت حوراد، ترا — یہ زمین کی جنت ہے کہ حوروں نے اسے پسند کرلیا ہے

مباں من ندرتئی سراتو چوں منی گلیں وطن — میں کیوں نہ تجھ پر جان نچھاور کروں میرے پھول جیسے وطن

مان مرک، و بد عبداللہ، گپت حاکٔ تئی ماں مشت — مرتے وقت خان عبداللہ خان نے تیری مٹی ہاتھ میں لے کر

اوسنگتان، سازئی نمیں گواہ کتے، چوشے گوشت — حاضر ساتھیوں کو گواہ بنا کر قسم کھائی تھی

قسم منا حیاتی، دیاں نہ من ترا چہ مشت، — کہ جب تک جان میں جان ہے تجھے ہاتھ سے نہیں دوں گا

ہے قسم منا منی او گور جا گہیں وطن — یہی قسم بھی ہے میرے گھر اور میری قبر کے وطن

آزاد جمالدینی

آزاد جمالدینی کا تعلق بھی میر گل خان نصیر کی طرح ضلع چاغی کے شہر نوشکی سے ہے۔ آزاد نہایت حساس مگر بردبار شخص تھے زمانے کے سرد وگرم نے انہیں تجربے کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ غم دوران کے تھپیڑوں سے زندگی بھر واسطہ رہا۔

معاشرتی عدم مساوات، سیاست میں دخل، فریب، علم کی راہ میں تنگ دلی اور تنگ نظری کو سدراہ پا کر ان کی طبیعت مشتعل ہوتی تھی، اس اشتعال نے شعر کی راہ سے ظہور کیا۔ ''مستیں توار'' ان کے پہلے مجموعہ کلام کا نام ہے۔ بعد میں آزاد جمالدینی اکیڈمی نے ''مستیں توار'' کی نظموں کو دیگر منظومات کے ساتھ شامل کر کے ''زرّان'' کے نام سے ان کا دیوان شائع کیا۔ بلوچی ادب رہتی دنیا تک آزاد جمالدینی کا احسان مند رہے گا جنہوں نے اس راہ میں بے پناہ قربانیاں دیں۔

کلام

بلوچی	اردو ترجمہ
سنگتاں اے وتی دیوان مروتیں آچ ءَ	دوستو! اپنی محفل کی اس بجھتی ہوئی آگ کو
اف کن ات روک کن ات گس گس ءَ بندان ءِ بروت	پھونکیں مار کر شعلوں میں بدل کر ہر ایک گھر کو چلیں
وطن ءِ مپر و چونیاان ءِ پاشاتگیناں	وطن کے گیسو جو بکھر چکے ہیں
چپ کن ات سک جن ات گس گس ءَ بندان ءِ بروت	انہیں سنواریں معطر کر کے ہر ایک گھر کو چلیں
بیائیں وڑ ات ہے سگان ءِ وتی تقدیر ءِ	آؤ اپنی تقدیر کی زنجیروں کو توڑ ڈالیں
وھم ءِ دستان ءَ بہ بندات پہ زندان ءِ بروت	وہم وادہام کو دست بستہ حوالۂ زنداں کر دیں
دیگاں کہنیں داب ئی بسوچیت پربنت ذتوکاں، داب ئی پسوچ ات	آؤ فرسودہ رسومات کی گڑیوں کو جلا کر خاکستر کر دیں
سینگ ءِ چیر اجن ات شعلہ بہ آزمان ءِ بروت	ایسی آگ میں جھونک دیں کہ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں
زین وتنگان ءِ پچک ترند کڑی کن آزات	گھوڑوں پر زین مضبوطی سے کس کر ایڑ لگائیں آزات
بور ءِ واگان ءِ بجن منزل ءِ ورکان بروت	مرکب کی باگیں ایسے جھٹکیں کہ منزل تک اڑتا ہوا جائے

عطا شاد

جدید بلوچی شاعری میں عطا شاد کی اپنی انفرادیت ہے۔ وہ روایت پرست نہیں، روایت شکن ہیں۔ غزل ہو، نظم ہو، شاعری ہو (جس کے بلوچی کے بانی بھی) خود ہیں۔ وہ ہم عصر شعراء سے یکسر ممتاز و مختلف ہیں۔ ان کے کلام میں معنی آفرینی، بلند خیالی، حسن بیان اور شوکت لفظی، نازک خیالی اور اپناذ خیرہ لفظی بلالتزام ملتا ہے۔ ندرت خیال وجدت بیان کے باوجود غیر مانوسیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ سننے یا پڑھنے والا الفاظ کے حسن انتخاب کے طلسم میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ قوم پرستی کے اس دور میں تقریباً سب ہی شعراء کے ہاں مشترکہ موضوع ہے۔ عطا شاد کے کلام میں آفاقی تصورات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ غلامی کی مخالفت جغرافیائی یا علاقائی تناظر میں نہیں کرتے بلکہ اسے اعلیٰ انسانی اقدار سے انحراف قرار دے کر اس کی تذلیل کرتے ہیں۔ عطا شاد کا شعر سلوگن نہیں کہ وقت گزرنے پر اس کی اہمیت برقرار نہ رہ سکے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے شعری عظمت میں اور نکھار آتا ہے۔ اس کی معنویت دعوت فکر دیتی ہے۔

بلوچی زبان میں آزاد شاعری کی ابتدا عطا شاد نے کی ہے۔ شروع میں انہیں آزاد شاعری کے حوالے سے سخت ترین مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر عطا شاد نے بدلائل مخالفین سے یہ بات منوالی کہ بلوچی قدیم شاعری خود بھی آزاد رہی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں آزاد شاعری کے حق میں عطا شاد نے لکھا ہے۔

''اگر ہم اپنی قدیم شاعری کو بغور دیکھیں، پڑھیں کہ ہماری یہ شاعری جسے آزاد شاعری کہتے ہیں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ نہ ہی باہر سے آئی ہے بلکہ غزل سے بڑھ کر یہ ہماری قدیم شاعری سے قریب تر ہے۔ مثال کے طور پر ہم اپنے دور اول کی شاعری کا جائزہ لیں اس میں شروع سے آخر تک ردیف اور قافیے کا التزام نہیں ہے۔ البتہ بعد کے زمانوں میں شعراء نے عربی اور فارسی سے متاثر ہو کر ردیف اور قافیے کا استعمال کیا ہے جیسے مغرب میں ملا فاضل اور ملا قاسم وغیرہ۔ اب یہ بحث کہ ردیف اور قافیہ ضروری ہے یا نہیں یہ طے کرنا ہمارا کام نہیں ہے، حقیقت یہی ہے کہ بلوچی شاعری میں یہ چیزیں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ اگر یہ غیر زبانوں سے اخذ ہیں تو ہم کیوں انہیں معیوب نہیں سمجھتے (دانکے پہ آزات شاعری۔ گچین رداننک ص:۱۶۸)۔

یہ بجا ہے کہ تمہاری فتح نے مجھے قریب المرگ کر دیا ہے
تم مسرور ہو کہ تمہاری جارحیت نے آج ایک مرتبہ پھر زندگی کے ایک بہادر بیٹے کو ہلاک کر دیا ہے
آزادی کے
امن کے بیٹے کو
اس بیٹے کو جو دھرتی کی آنکھوں کا تارا، دل کی تمنا
وہ بیٹا جو انسانیت کے تحفظ میں جد و جہد کا حاصل تھا
وہ بیٹا جو دوامی مسرت کی تلاش کا حاصل اور مقصد تھا
وہ بیٹا جو محبت کی دائمی آرزو تھا
عذاب کے انجام کا مژدہ
تم گردنیں مارنے سے زندگی کی حس کو مارنا چاہتے ہو؟!
توڑنے کے عمل سے پھول کی خوشبو کو پھیلنے سے روک سکتے ہو!!
میری موت کی خواہش ہے تو روح کو ختم کر دو
میرے قتل کے خواہاں ہو تو محبت کے جذبوں کو ہلاک کر دو
میری بے نشانی پر اگر خوش ہو تو میرے شعور کو پامال کر دو
میرے علم پر تیر برساؤ
میں مر کر فنا نہیں ہو سکتا
میں محبت ہوں اغوا نہیں کیا جا سکتا
ابد تک میرے قدموں کے نشان موجود رہیں گے
جب تک زندگی قائم ہے میرے خون سے کھنچی ہوئی لکیر برقرار رہے گی
میں مر گیا تو، تو بھی مرے گا
تو زندہ ہے تو میں بھی زندہ رہوں گا

اکبر بارکزئی

اکبر بارکزئی میر گل خان نصیر، میر محمد حسین عنقا اور آزاد جمالدینی کی طرح ایک اور قد آور شاعر ہیں۔ جن کی شاعری کی پشت پر بلوچی قومی جدوجہد کی تحریک کا ہاتھ ہے۔ بلوچ قومی تحریک کا مختصر احوال بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ملک کے اندر رہتے ہوئے حقوق کی جنگ تھی جو بدلتے ہوئے حالات میں آج بھی کسی شکل میں جاری ہے۔ اکبر ایک سیاسی ورکر تھے۔ انہیں اس کی جدوجہد، سیاسی رہنماؤں سے قربت اور ترقی پسندانہ خیالات رکھنے پر کچھ وقت کے لیے سزائے قید بھی ملی، میر گل خان نصیر، عبداللہ جان جمالدینی، لال بخش رند، مراد ساحر، محمد بیگ اور دوسرے ترقی پسند ساتھیوں کی جان بنے رہے انہیں بھی سرکار نے ہمیشہ اپنی نگاہوں میں رکھا۔ اکبر، یوسف نسکندی، لال بخش رند اور قادر بخش مطاہر کو ایوب خان کے دور میں وزیر خارجہ کے جلسے کو درہم برہم کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ رہائی کے بعد اکبر دوبارہ فعال ہوا، بلوچی اکیڈمی کراچی ان کی کوششوں سے بنی تھی۔ حکومت کو ان ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تہہ میں تخریب کاری نظر آئی اور لیاری کراچی کے باشعور نو جوانوں پر ایک مرتبہ پھر یلغار ہوئی بہت سے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ مگر اکبر بارکزئی بچتے بچاتے خلیجی ریاستوں کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے بغداد اور پھر لندن میں جا کر مستقل قیام پذیر ہوئے۔ ایوبی دور میں اکبر بارکزئی نے کچھ عرصے تک ''مینگل خان مری'' کے نام سے شاعری کی تھی۔ اکبر کی شاعری کے بارے میں میر عبداللہ جان جمالدینی ان کے مجموعے کلام ''روچا کئے کشت کنت؟'' میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''اکبر نے بہت کم شعر کہے ہیں مگر جو کچھ کہا ہے وہ لاجواب ہے ان کی زبان میٹھی پیاری اور حسن بیان دلکش ہے شاعری میں ان کا علم پختہ روشن اور بلند ہے۔

اکبر کی شاعری جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ انکے مقصد کی بھی آئینہ دار ہے۔

اکبر کیا چاہتا ہے؟ زندگی کو کیوں اور کس لیے بدلنے کا خواہاں ہے ان کی شاعری میں ان تمام سوالات کے جوابات پوشیدہ ہیں وہ انسان کی محبت میں یقین رکھتے ہیں ان کی فکر آفاقی ہے وہ ظلم و جور سے بہت دور ہیں اور ظلم و جور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اکبر کے احساسات شدید ہیں۔ ان کا دل بہت نازک ہے پھول کی طرح کھلتا اور مرجھا جاتا ہے مگر وہ زندگی کے مصائب کا خندہ پیشانی سے اس یقین کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں کہ یہ مصائب دائمی نہیں ہیں۔ زندگی بالآخر بدل کر رہے گی۔

اکبر بارکزئی ایک محب وطن، محب قوم اور محب انسان شاعر ہیں وہ معروضی حقیقتوں کا اظہار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔"

کلام

سورج کو کون گل کر سکتا ہے
(ارنستو "چے" گیفارا کی شہادت پر)

۱

سورج کو کون گل کر سکتا ہے
شعور کو کون قید کر سکتا ہے
تاریک راتوں کی بستی میں
چمگادڑوں نے خوشی منائی
سورج کی موت پر
زندگی کے شہنشاہ کے
موت کا اعلان کیا
شعور کے دروازوں کی ہوا
شاندار "فی بس" نے
دھرتی، آسمان
ستاروں، چاند اور کہکشاں
عدم کے راتوں کے بارے
صحراؤں میں گم ہوں گے
محبت گلوگیر ہوگی
جوش اتر جائے گا
شاعری مرجھا جائے گی
ماسوا شعور کے بحر

زندگی کے شہنشاہ
جنابِ فیبس کے

۲

زندگی کی افزودتی
کبھی بھی نہیں جی اٹھے گی
آڈونس کے بغیر

۳

پاک سورج کو ہلاک کرنا
شعور کو قید کرنا
کسی کے بس میں نہیں
کسی کے بس میں نہیں
تاریک راتوں کے قریوں میں
بیچارے چمگادڑوں نے
خوامخواہ گیت گائے
خوشیاں منائیں
سورج تو طلوع ہوگا
ہر صبح جلوے بکھیرتا ہوا
مست و نعرہ زناں
''ہاں اے شب زادگاں
میں عظیم فیبس ہوں
جیالا ارنستو ہوں''

۴

زندہ جاوداں!
اپنی کرنوں کی بارش
میں بکھیرتا ہے ہرسو
جیالے ارسطو کا
پھول جیسا تبسم
سورج کو کون گل کرسکتا ہے
شعور کو کون قید کرسکتا ہے

۱:۔ Phoebus Apollo یونانی اساطیر میں شعور اور شاعری کے دیوتا۔

۲:۔ محبت اور حسن کی یونانی دیوی۔

۳:۔ آدونیس Adonis افرودتی کا محبوب جو جوانی میں مارا گیا۔

۴:۔ یعنی گیفارا

مراد ساحر

بلوچی زبان کا مقبول شاعر جسے ''مزدور شاعر'' بھی کہنا چاہیے۔ جدید بلوچی ادب کے پہلے دن سے ہی تصنیف و تخلیق کے میدان میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ ساحر کی شاعری میں بے پناہ شگفتگی، حسن بیان اور روانی پائی جاتی ہے، تشبیہات، تراکیب اور استعارے بلوچی معاشرت سے اخذ کرتے ہیں۔ جیسی خودداری عام زندگی میں اپنائی ہے وہی بانکپن ساحر کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ غزل مراد ساحر کا حقیقی میدان ہے۔ ''گل کار چکنکار'' میں جناب صبا دشتیاری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ۔

''سید ہاشمی کے بعد جو شخص محبت و اخلاص سے فن کے رشتے میں لعل و موتی پرو رہا ہے اور غزل کا حسن بڑھا رہا ہے وہ مراد ساحر ہے۔ مراد ساحر کے بارے میں بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ہاں سادگی و پرکاری ملتی ہے جو اس کی غزل کی روح ہے۔ زبان میں سادگی ہے مگر فن کے میدان میں وہ قارئین کو چونکا دیتے ہیں۔ طبیعت میں جدت پسندی پائی جاتی ہے اس لیے اپنی ہر غزل میں ایک نیا تجربہ کرتے ہیں۔ خود ساحر کا کہنا ہے کہ اسے اس طرح کے تجربات سے لذت ملتی ہے۔''

مراد ساحر کا پہلا مجموعہ کلام ''پاہار'' اور دوسرا ''چیہال'' حال ہی میں ''چیہال'' کو اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔

غزل (ترجمہ)

وہ گھڑی جلد آنے کو ہے!
ہر کوئی مصائب سے چھٹکارا پائے گا
ایسا ''فیصلہ'' ہونے کو ہے
پاک اور پلید کھل کر سامنے آئیں گے
موت اور زندگی کے اسرار کو
پانا بھی ایک علم کا متقاضی ہے
مجھ سے پوچھ کہ دہر کی خوں خوار

آنکھوں میں میں نے کیا دیکھا
تیری دنیا کا یہ دستور ہے
کوئی روتا ہے تو کوئی ہنستا ہے
تیرے پاک دین کے حوالے سے
دولت مند غریبوں کو لوٹتا ہے
جو اس زندگی میں بہل ہے
وہ فرد ا جنت میں کب ہوگی
بھوکے پیٹ اور بھوک کی تمازت میں
ایمان کا درخت کیسے پھل پھولے
وہ خوروں کو گلے نہیں لگائے گا
جو زندگی کا ساتھ نہیں دیتا
ہزار سال کے طویل سفر میں
ہم نے تیرا اعلیٰ کردار نہیں دیکھا
ملا ان باتوں کو جانے دو
تیرے لیے کافی ہے روٹی اور مسجد
اسے شرف حاصل نہیں ہو سکتا ساحرؔ
جو محبت کی آگ میں جلا نہ ہو

جی آر ملا

بلوچی کے انقلابی شاعر جی آر ملا کی شاعری غالب کے اس شعر کی تعبیر ہے کہ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ اور بات ہے کہ ان کے ہاں حب قوم، حب وطن، حب انسانیت کا بے پایاں خزینہ ہے، وہ بے خوف ہو کر اس معاشرے پر، پرزور انداز میں تنقید کرتے ہیں۔قدیم اوہام اور رسم رواج کے چیتھڑے اڑاتے ہیں۔دل دردمند اور نگاہ بلند، طبع مضطر، سخن شعلہ اثر کے مالک ہیں۔ادب کی تزئین و آرائش میں جی آر ملا کی خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ روز اول سے سید ہاشمی اکیڈمی کراچی میں اہم عہدوں پر زبان کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں'' بون'' جی آر ملا کے مجموعہ کا نام ہے۔

غزل (ترجمہ)

میں صدقے میں قربان تمہارے موتیوں بھرے دہن کے
کچھ بول کچھ بات کر میں صدقے کہ رات کی رنگت بدل جائے
تمہارا لپٹنا، تمہاری ادا، اور تمہارے جسم کی حدت
بخدا میرے رنج و غم اور شدید بخار کا علاج ہے
تم ہی میری زندگی، تم ہی میری جان اور مال و متاع
تمہارے علاوہ مجھے دنیاوی نفع درکار نہیں
بھیک دے مجھ کو مخیر مجھے مایوس نہ کر
میں ہوں سرخیل ترے درگاہ کے فقیروں کی صف کا
کوئی بھی ایسے رسوا نہیں ملا جہاں میں جیسے تو
ہر کسی کو ادراک ہے اپنے نام اور اپنے رتبے کا

کریم دشتی

کریم دشتی ایک اچھے شاعر اور ایک بالغ نظر محقق و مدبر انسان تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور ''شر گداری'' مرتب کر کے بلوچی کے بڑے بڑے سخنوروں کو حدف تنقید بنایا ان اعتراضات کا جواب آج تک نہیں دیا گیا۔ اس لحاظ سے کریم دشتی کی تنقید کو ایک طرح سے درجہ سند حاصل ہے، شعر انہوں نے بہت کم کہے، مگر جتنے شعر دستیاب ہیں وہ مروجہ شعری سطح سے بلند ہیں۔ ان کو انگریزی، عربی، فارسی، اردو پر عبور حاصل تھا ایک حوالہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں ظاہر ہوتا ہے کہ کریم دشتی مندرجہ بالا زبانوں میں شعر موزوں کیا کرتے تھے اگر چہ راقم کی نظر سے ایسا کلام ابھی تک نہیں گزرا۔ انہوں نے بلوچی ادب کی مختلف اصناف پر بلوچی میں ایک کتابچہ ''لوزانک'' بھی شائع کرایا جو نایاب ہے۔

غزل (ترجمہ)

خدا کرے وہ دن بھی آئیں کہ مجھے قیام کا موقع ملے
اور آشنا کی طرح تیرے گھر کا رستہ ملے
یہ جہاں میرے لیے قبر سے بھی تنگ تر ہو، مگر
تیری پیشانی کے صدقے اگر میرے لیے کھلی ہوئی ہو
میرے وطن میں مجھے سر بازار رسوا کیا گیا ہے
میرے رب کہیں تیرا در ہے کہ میں وہاں سرخرو ہوں
تیرا زنخداں جس کے گرد ایک جہاں سمٹ آیا ہے
خدا کرے یہ میرے لیے چاہ بابل بن جائے
ہر ایک واعظ مجھے خدا کے قہر سے ڈراتا ہے
خدا کرے امن لائے ایسا اللہ ہو!!
میرے پاؤں ٹوٹے ہوئے میں پل صراط کی راہ کیسے پار کروں
میری جان قربان بہشت کے لیے اگر مجھے رستہ ملے
موت تو موت ہی ہے اگر آجائے مگر میری تو زندگی موت ہے
ایسا ہو کہ میری یہ دونوں مشکلیں یک جا ہو جائیں

بشیر بیدار

بشیر بیدار ترقی پسند اور حق آگاہ شعراء میں صف اول میں ہیں ،انہیں اپنے ماحول ،معاشرے اور سوسائٹی کی حالت کا شدت سے احساس ہے وہ اپنے عوام سے ہی نہیں بنی نوع انسان سے محبت کرتے ہیں ۔اپنے لوگوں کی ناخواندگی ،پسماندگی ،غربت اور مقتدر و قومی طبقوں کی لوٹ کھسوٹ ،ناانصافی بشیر بیدار کا پسندیدہ موضوع ہے ۔بشیر بیدار کی شاعری پر مشتمل دو مجموعے ''گوربام''اور'' ہزام'' بلوچی شاعری میں بلاشبہ بہت بڑا اضافہ ہیں ۔

کلام (ترجمہ)

بربادی اور تباہی اے دوست اور کیا ہے
کہ یہ دل قیامت تک تمہاری زلفوں کا اسیر ہے
ایک بار دیکھو تو ہزار بار دیکھنے کی تمنا ہو
محبوب کے اندام یوں لگتا ہے خداوند کا کلام ہے
خود بھی کچھ نہیں جانتے دوسروں کو بھی موقع نہیں دیتے
قاضی اور ملاؤں سے میں تو باز آگیا
دہر کے بخشے ہوئے سارے غم میں نے بھلا دیے
مگر دل میں سلگتی یہ آگ ہمیشہ سلگتی رہے گی
تم بجھے ہوئے تیر میرے دل پر آزماؤ
میں دیکھوں گا کہ کس دور تک درد دل الزام ہے

مبارک قاضی

''باغی'' نوجوان شاعر جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو، بہت پڑھا لکھا، جس نے زندگی کے دکھوں کو قریب سے دیکھا اور جس کے علم نے ظلم کے آگے سر جھکانے سے انکار کیا۔ مارشل لاء نے اسے نذر زندان کیا مگر اس کی حق گوئی اور بے باکی ''نقرئی حروف'' بن کر زرنوشت کے صفحات پر پھیل گئی۔ یہ مبالغہ نہیں ہوگا اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ عطا شاد کے بعد حقیقی معنوں میں حسن بیان، اندرونی کرب پختگی او سب سے بڑھ کر حسین پیرایہ اظہار انہیں ممتاز مقام دیتے ہیں۔

کلام (ترجمہ)

مجھے جلا کے خاک کر
ظلم کے انگاروں پہ بھون
مجھے توپوں کے ساتھ دم کرادے
تلواروں نیزوں کے گھاٹ اتار دے
مجھے زنجیروں میں جکڑ ڈال
(بیشک) مجھے دار پر کھینچ لے
یہ میرے دل کی تمنا ہے
یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا
اگر قوم کے لیے مجھ سے یہ سلوک روا رکھا جائے
مجھے ذرا قلق نہیں ہوگا
شاید میرا خون
غریب کے آسمان کی کہکشاں بن جائے
تاہم مجھے یقین ہے
کہ ظلم و جبر کا انجام
تمہارے قلعوں اور محلوں کے لیے
تباہی ہے تباہی (کا پیغام ہے)

ابراہیم عابد

ابراہیم عابد نے اپنی شاعری کے پہلے مجموعہ ''نیکیں واہگ'' میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں شاعری شروع کی تھی ایک دو سال تک وہ خود میں پوشیدہ رہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک انہوں نے جو کچھ کہا ''نیکیں واہگ'' میں سمیٹ لیا مگر اس کے بعد ان پر اظہار کے دروازے تیزی سے کھلتے گئے ''شہم'' میں ان کی شاعری میں پختگی آئی اور ''نمیراں'' میں واقعی زندہ جاوید ہو گئے۔

بلوچی شاعری میں دور جدید جیسا کہ جناب فضل خالق نے بھی لکھا ہے قومی شاعری، سیاسی شاعری اور انقلابی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں یہی رنگ سارے رنگوں میں نمایاں ہے ابراہیم عابد نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔

غزل (ترجمہ)

احساس غم نے میرے منہ میں زہر گھول دیا ہے
آنکھیں تیری یاد میں بارش برساتی ہیں
میری زندگی کو دکھوں میں مبتلا کرنے کے لیے
یوں لگتا ہے سارے طاقت دروں نے سازش کی ہے
مجھے گل بوستاں کی طرح عزیز ہے
تیرا دیا ہوا درد جسے میں نے سنبھال رکھا ہے
اپنی محبت کو زندہ جاوید کرنے کے لیے
میں بھڑکتی ہوئی آگ میں کود گیا ہوں
تم بیشک بجلیاں گراتے رہے کہ میں نے
سختیاں کچکور کی طرح برداشت کی ہیں
گفتگو اپنی مختصر کر عابد کہ یاروں نے
جہالت کو طعنے کی شکل دے رکھی ہے

الفت نسیم

الفت نسیم کا مجموعہ کلام "آزگیس ریش" غالباً ۱۹۸۴ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ سے پہلا انعام پایا تھا۔ خود الفت کا کہنا ہے شاعری انہوں نے ۱۹۶۳ء میں شروع کی تھی۔ وہ "آزگیس ریش" میں رقمطراز ہیں۔

اس مجموعے میں ایک شاعر کی شاعری بائد وشاید ہی ملے مگر ایک دل جسے انسان یا ایک "حساس ہستی" کے دل سے اٹھتے ہوئے طوفان کا اظہار ضرور ہے، ۱۹۶۳ء میں شاعری کا یہ عطیہ میری انجان محبت نے مجھے پہلے مسرور اور بعد میں آنسوؤں کا تحفہ دیا۔ میری زندگی ایک بند دائرے میں مقید ہو کر رہ گئی مگر حقیقتوں نے اس دائرے میں راہ بنائی تو یہ گرہ اس طرح کھلتی گئی کہ کئی ایک در کھل گئے اب میری محبت بے پایاں سمندر کی طرح مفرور ہے۔ اسے نہ تو خون اور استخواں کی حاجت ہے نہ زور ونغمہ کی۔ یہی شاعری ہے۔

غزل (ترجمہ)

سوز وغم زندگی کی متاع ہے
آہ نالہ ہماری عادت ہے
عشق کا معاملہ طے ہو چکا ہے
اس سے زیادہ جنوں اپنا ہے
تم سے کبھی بھولا نہیں
الفت اگر چہ بیگانہ ہوش ہے
منزل اسے ہی ملتی ہے
جو سفر کے لیے بے چین ہے
عید اور بہار، اس پہ مستزاد چاندنی
مگر نسیم ہنوز سوگوار ہے

عنایت اللہ قومی

بلوچی ادب میں ایک معروف اور معتبر نام ہے بلوچی جریدہ جب کراچی سے شائع ہورہا تھا چند نامور لکھنے والوں کی صف میں قومی بھی موجود تھا جب سے اب تک نثر میں نظم میں اور اپنی استطاعت کے دوسرے ذریعوں سے وہ برابر زبان کی ساخت و پرواخت میں مصروف و منہمک ہیں۔ ان کی اور ان کے دوسرے معاونین کی کوششوں سے پنجگور میں عزت اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا جس نے ادبی میدان میں قابل لحاظ کام کیا ہے۔ قومی شعر و سخن کی جانب میلان رکھتے ہیں ان کو زبان پر دسترس حاصل ہے ''زرد ء ارمان'' ''دل ء توار'' ان کے دو شعری مجموعے ہیں جو عزت اکیڈمی پنجگور نے زیور طباعت سے آراستہ کیے ہیں اور ان کے '' پچھے'' میں اب تک بہت سا شعری اندوختہ محفوظ ہے۔

غزل (ترجمہ)

درد عشق سے واقف نہ ہوتا میں شاعر نہ بنتا
حسن کا نظارہ نہ کرتا عاشق نہ بنتا
انجان بن کر تمہاری جانب دیکھ نہ سکا
اور اب تمہارے عشق کو چھپانا ممکن نہیں
دل میں پوشیدہ طور پر عشق کا جو چراغ روشن ہے
میں اس کی روشنی میں غموں کو چھپا نہیں سکا
ہمارا عشق اور تمہاری صورت نیش عقرب
اسے جھٹلانا ہماری طاقت سے بعید ہے
ماشاء اللہ آپ کا سن بیس سے دو سال کم ہوگا
چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانکے چھپنا نہ جانے
یہ سیلاب گریہ ہے قومی معلوم نہیں کیا
ورنہ جب تک عشق کے بادل گرجے
میں انہیں خاطر میں نہیں لایا

آدم حقانی

آدم حقانی مرحوم کی شاعری اپنی زمین اور اپنے عوام سے محبت کی آئینہ دار ہے ان کا رنگ سخن اگر چہ مائل بہ قدامت ہے مگر ان کی حقیقت پسندی، کمزوروں پر ظلم کے خلاف ان کی للکار، کسان، مزدور، شبان اور کمزور طبقوں کے لیے ان کی دلسوزی نے انہیں عصر حاضر کے شاعروں میں نمایاں کر رکھا ہے۔ آدم حقانی کا مجموعہ کلام اس کے علاقے میں واقع ہیبت ناک پہاڑ ''چی درون'' کے نام سے آزاد جمالدینی اکیڈمی نے ان کی وفات کے بعد چھپوایا ہے۔

کلام (ترجمہ)

تمہارے آنسوؤں کے موتیوں کو میں اپنا خزینہ بناؤں گا
نقد مسرت کو دل سے بھلا دوں گا
تمہارے غم اور تمہاری آہوں نے میری نیندیں چھین لیں
میں تاریک راتوں کو بھاگ دوڑ میں صبح کرتا ہوں
بوجھ بہت بھاری اور آدم تیرے کندھے کمزور
حقیقت میں، میں تمہیں مشکل میں ڈال دوں گا

اللہ بشک بزدار

شعری ادب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معروضی حقائق کی نشاندہی کرے یہ معروضی حقائق قوموں کے درمیان ابھرنے اور ٹوٹنے والے عصری افکار و مسائل کو خود میں سمیٹ لے۔ نظم کی صنف وہ صنف ہے کہ ہر طرح کے مضامین کو خود میں سمیٹنے اور بیان کرنے کا وصف رکھتی ہے اللہ بشک نے نظم کے میدان مرکب فکر دوڑائے ہیں۔ آزاد نظم کا میدان منتخب کیا ہے۔ یہ تعارف ہے اللہ بشک بزدار کے فن کا۔ جسے جناب سلطان نعیم قیصرانی کے لفظوں میں پیش کیا جارہا ہے۔ اللہ بشک بزدار کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ ''هشکیں رکھ سوز بنت'' یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کی انعام یافتہ ہے۔

عبدالمجید گوادری

عبدالمجید گوادری اگرچہ پاکستان کا باسی ہے مگر انسانی ضروریات اور معاش کی مجبوریوں نے اسے عارضی طور پر وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا وہ اکثر اپنی خاک سے محبت کے باعث وطن آتا رہتا ہے، عبدالمجید گوادری جن کا تعلق درس و تدریس سے ہے ان کی شاعری دوسرے بلوچ شعراء سے مختلف نہیں۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

البتہ استاد عبدالمجید کے ہاں رجائیت کے جذبہ جوان ہے خصوصاً اس کے مخاطب بلوچ نوجوان ہیں جو مایوس کن حالات کو بدل سکتے ہیں تب ہی انہوں نے اپنے مجموعے کا نام ''گلیں باندات'' (صبح درخشاں) اکادمی ادبیات پاکستان نے اس کتاب کو انعام سے نوازا ہے۔

عباس علی زیمی

سیّد ظہور شاہ ہاشمی کے سینکڑوں شاگردوں میں سے ایک عباس علی زیمی ہیں۔ وہ بھی شعر وفن میں اسی راہ کے رونورد ہیں جس پر بیشتر بلوچ شعراء اور اہل قلم کا گزر رہا ہے اپنے اردگرد کے حالات اور واقعات سے حساس طبائع صرف نظر نہیں کر سکتے کہ اس کا اثر خود ان پر بھی قوم کی طرح ہوا کرتا ہے۔ سیاسی معاشی اور انسانی حقوق کے لیے جدو جہد ان کا بھی پسندیدہ موضوع ہے۔ کئی سالوں سے وطن سے دور اپنے پیاروں کے فراق میں مبتلا شاعر کا لب لہجہ اگر تلخ ہو تو تعجب کیا ہے۔ محبتوں کی اس پیاس کی شدت نے ''بینار'' میں ڈھل کر زیمی کو متعارف کرا دیا ہے۔

پیرل شئے تگری

''پلگاریں دروت'' پیرل شئے تگری کا مجموعہ کلام ہے۔ پیرل شئے تگری بہت اچھے شاعر اور بلوچی ادب کی دوسری اصناف میں دخیل اہل قلم ہیں۔ ان کے جذبہ جوان و فروانی کو دیکھتے ہوئے دل کو ڈھارس ملتی ہے کہ بلوچی ادب کا مستقبل روشن ہے۔

غنی غریب (مرحوم)

''ماہ گل دمہ گون'' سید ہاشمی کے ایک اور اصلاح یافتہ شاعر غنی غریب مرحوم کا مجموعہ ہے، جس میں ہلکے پھلکے گیت ہیں۔ یہ تو وہ بلوچ شعراء ہیں جن کے دواوین زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں اس کے علاوہ بھی بلوچی میں انگنت سخنور ہیں جن کے ناموں پر اکتفا کرنا طوالت سے بچنے کا طریقہ ہے۔

نمائندہ شعراء

قاضی عبدالرحیم صابر، احمد زہیر، احمد جگر، میر عیسیٰ قومی، پیر محمد زبیرانی، اسماعیل ممتاز، رزاق نادر، مومن بزدار، اسحاق ساجد بزدار، فضل خالق، غوث بہار، علی دوست، فضل مشتاق عاجز، عاجز پنجگوری، ابراہیم ابرار، خلیل آبسری، یار محمد نوقلاتی، گل محمد وفا، اسحاق شمیم، محمد حسین عاجز، دوست محمد بیکس، مراد آوارانی، صباد شتیاری، عبدالقادر اثیر، عبدالحکیم ھلگو، نصیر کبدانی، ملک محمد طوقی، اشرف سربازی، پیر بخش پیرل، حبیب اللہ امیر، اکبر غمشاد، انور صاحب خان، اکرم صاحب خان، محمد صادق مری، فیض بخشا پوری عبدالرحمان غور، رشید عطش، صدیق آزاد، ظفر علی ظفر، چراگ لاشاری، عابد آسکانی، کریم آزات، غنی پرواز، نصرت اللہ شیدا، فقیر محمد عنبر، شوکت صحرائی، غوث بخش صابر، سلطان نعیم قیصرانی، قاضی عبدالحمید شہزاد غلام فاروق، منیر مومن، طارق بخی، وہاب شوہاز، بیزن صبا، اکبر علی اکبر، خیر محمد محسن، یار محمد محسن، یاسین بسمل مومن معراج، عاقل بابا نوشاد، فضل فیضی، نور خان بزنجو، محمد بیگ بیگل، منظور بلوچ، واحد بزدار، منیر عیسیٰ احمد علی میر، عظیم آسکانی، خیر جان فیض، تاج محمد تاجل، عیسیٰ نوری، علی عیسیٰ، تاج محمد طائر، ابوالقاسم عینی، خواستی خان خارانی اور محترمہ زینت ثنا۔

بیرون پاکستان کے بلوچ شعراء

پاکستان، ایران اور افغانستان کے علاوہ بلوچ قوم کی ایک بہت بڑی تعداد خلیجی ریاستوں میں تلاش معاش کے سلسلے میں آباد ہے، ان میں اعلیٰ پائے کے ادباء اور شعراء ہیں جو اپنے علاقوں میں ہی نہیں پاکستان کے ادبی اداروں کی سرپرستی بھی کرتے چلے آرہے ہیں ان میں سے زیادہ تر تعداد ایسے اہل قلم کی ہے جو مشہور شاعر اور دانشو سید ظہور شاہ ہاشمی کے متبعین میں سے ہیں، ہم اس سلسلے میں معروف شاعر اور دانشور جناب عابد آسکانی کے شکر گزار ہیں جنہوں نے خلیجی ریاستوں کا ادبی دورہ کرنے کے بعد ان شعراء کے نام اور کلام کا ایک انتخاب ''مزن ہور، بلوچ لچہ کار'' چھاپ کر ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔

مسقط او مان

میجر مجید، عبدالمجید گوادری، غلام حسین شوہاز، پیرل شئے تگری، جی ایم بلوچ، عبداللطیف شاہنواز، خالد قاضی، حیدر وفا، علی پرواز، امام بخش عابد، شہداد چیسری، نواز خان، منیر تگرانی، بشیر شہزاد، عبدالواحد شوباز، مراد بزگ، بشیر صادق، ابراہیم ابل، نصیر بزگ، حمید درد یگ، بہرام بابو، پلان مراستارنی، صابر آسمی، عبدالرحیم واہگ، خالد تگرانی، غنی ھمبل، محمد عبدالرحیم گوہری، اسلم ابیتک، قادر بخش قادر، اکبر تبسم، غفور ہاشم، نصیر ناشاد، فقیر محمد نیازی، ابوالحسن ابل، رشید احمد قومی، عابد علی گورگیج، خلیل واہگ، عبدالحکیم راج، غلام نبی پابند، عبدالواحد بندی، شبیر احمد سلطانی۔

قطر

حاجی سلیمان دلشاد، دین بلوچ، محمد حسن عاجز، عبداللطیف عادل، علی عاقل، علی شاکر، غلام رسول مہر۔

بحرین

اسماعیل ممتاز، غلام گوری، دریخان مدی، فقیر شاد، غلام یاسین ملا، واحد بخش راہی، چاکر علی ابرار، رشید صلاح، محراب خان، ستار میاد، عبیداللہ گوبزی، امام بخش جعفر، داد محمد دادل، رحیم جان کوہ دیمی، عبدالرحیم ارمان، شریف بیوس، محمد یاسین تگرانی، غنی ملیری، لیاقت علی گولڑی، خالد حیدر، حاصل وطن یار، مدی مصطفیٰ انور ڈالچار مندی، محمد حسین نسکندی، محمد علی شہار۔

کویت

م۔ب۔راجی، عبدالعزیز ھداری، محمد سربازی۔

امارات

ظفر علی ظفر، پیر بخش پیرل (مرحوم)، عباس علی زیمی، مراد بخش مراد، بوھیر علی کلاچی، خداداد آزات، عبدالغفور کوپچی۔

بلوچی زبان کی شاعری میں وطن سے محبت

بلوچستان مضبوط، غیور اور جفاکش عوام کی سرزمین ہے۔ صدیوں سے یہ نہ صرف آزاد اور امن پسند انسانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ بلکہ بلوچ قوم نے من حیث المجموع تحریک آزادی میں اپنا کردار نبھایا جبکہ پاکستان بننے کے بعد اس کی آزادی اور خودمختاری کا نگہبان رہا۔ بلوچی زبان میں حب الوطنی کے حوالے سے شاعری میں تنوع اور حقیقی جذبات نگاری، جرات، بہادری اور امن سے محبت کے جذبات فراوانی سے ملتے ہیں۔ خصوصاً بلوچی ملی نغموں میں جس جوش اور جذبے کا اظہار ملتا ہے وہ پاکستان کے خلاف جارحانہ جنگ مسلط کرنے پر آزادی، امن اور ناموس ملی اور دفاع وطن کے زمانوں میں اور بھی نکھر گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ صرف افواج ہی کے درمیان نہیں ہوئی بلکہ دفاع وطن کے عظیم فریضے میں پاکستان کے تمام علاقوں کے عوام کا عملی حصہ بھی تھا، ۱۹۷۱ء میں ایک مرتبہ پھر ایک امتحان عظیم سے واسطہ پڑا۔ عوام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کے فرض سے بے بہرہ نہیں، شعراء بھی عوام ہی کا روشن خیال حصہ ہیں۔ بلوچی شعراء نے ملی نغموں کی تخلیق کر کے قوم میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔

بلوچی میں ملی نغموں کی اشاعت اگر چہ اخبارات اور رسائل میں بھی ہوئی مگر الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے وطن کی محبت سے مالا مال ان گیتوں نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے بلوچی، براہوئی اور پشتو زبانوں میں ملی نغموں کے ذریعے دفاع وطن کا خوشگوار فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے زمانے میں بلوچی موسیقی کا شعبہ مشہور شاعر جناب عطا شاد کے حوالے تھا انہوں نے نہ صرف خود یادگار ملی نغمے لکھے بلکہ دوسرے شعراء کا کلام حاصل کر کے اس قومی جدوجہد کا دائرہ وسیع کیا، موسیقی اگر چہ ہمارا موضوع نہیں مگر ملی نغموں کے حوالے سے یہ ذکر کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ مرید بلیدی، فیض محمد، محمد علی، رحیم بخش، محمد شفیع، عبدالستار وغیرہ فنکاروں نے جذبہ حب الوطنی میں سرشار ہو کر بلوچ شعراء کی جو جو ملی نغمات گائے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور قوم کو اس جذبہ ملی کے اس مثبت اظہار پر خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے۔

بلوچی میں ملی نغمے تقریباً تمام شعراء نے لکھے مگر خصوصیت سے جن کے نغمات مقبول ہوئے ان میں عطا شاد، کریم دشتی، مراد ساحر، قاضی عبدالرحیم صابر، آدم حقانی، فقیر محمد عنبر، محمد ہاشم شائر، حکیم خدائے رحیم مرحوم، میر محمد زبیرانی، غوث بخش صابر، عبدالقادر اشیر، صوفی فضل پنجگوری، مومن بزدار، عبدالصمد شاہین، میر محمد حسین عنقا، الفت نسیم قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ان دنوں میر گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، اکبر بارکزئی، صدیق آزاد نے بھی بڑی تعداد میں نغمے لکھے۔ مگر غیر ضروری سرکاری احتیاط ان کے نشر کرنے میں سدراہ رہی بہرحال جب پاکستان میں حب الوطنی کی تاریخ لکھی جائے گی تو بلوچ شعراء کی وطن سے محبت ایک روشن باب بن کر اس میں شامل رہے گا۔

بلوچی زبان میں مذہبی تحریریں

بلوچی زبان میں مذہبی تحریریں مقابلتاً بہت ہی کم ملتی ہیں ۔ قیام پاکستان سے پہلے جب انگریزوں نے بلوچستان میں مشنری سرگرمیوں کے لیے زمین ہموار کرنا چاہی تو یہاں کے مذہبی حلقوں نے ایسی سرگرمیوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس کا مقابلہ کیا اسی ردعمل کے طور پر علامہ محمد فاضل اور اس کے رفقاء خصوصاً حضرت مولانا حضور بخش جتوئی نے بلوچی نظم ونثر میں قرآنی تعلیمات ، احادیث نبوی سیرت مطہرہ اور صحابہ کرام کے بارے میں لاتعداد کتابیں لکھیں ۔ انہوں نے کلام مجید کا بلوچی ترجمہ بھی شائع کیا یہ طبع شدہ واحد ترجمہ ہے جواب نایاب ہو چکا ہے ۔ اس کی ایک جلد مکتبہ درخانی کے ورثاء کے ہاں دستیاب ہے کئی سالوں سے بار دیگر اس کی اشاعت بلوچی اکیڈمی میں زیر غور ہے ۔

کلام مجید کا ایک اور ترجمہ سترہ پاروں تک حضرت مولانا عبدالصمد سر بازی نے کیا ہے جسے ماہنامہ ''سوغات'' قسط وار چھاپتا رہا ہے ۔ ابھی تک وہاں سے مکمل صورت میں شائع نہیں ہو سکا ہے ۔ جناب حاجی عبدالقیوم بلوچ نے کلام مجید کا بلوچی ترجمہ مکمل تو کرلیا ہے مگر اب تک اشاعت معرض التواء میں ہے ۔ انہی کی ادارت میں ماہنامہ ''زمانہ'' بلوچی میں مذہبی معلومات پر مبنی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے تاہم مستقل عنوان صرف ماہنامہ ''سوغات'' کراچی نے بنا رکھا ہے جس کے مدیر ''ملت اسلامیہ '' کے ایک عالم دین اور دیو بند سے فارغ التحصیل علمی شخصیت حضرت مولانا خیر محمد ندوی ہیں ۔ اس جریدے میں بلوچی اور اردو میں دینی امور پر قارئین کی قابل قدر رہنمائی ہو رہی ہے ۔ اس کے علاوہ بھی مولانا خیر محمد ندوی نے ''نماز حنفی'' (ترجمہ) ''کچکول'' وغیرہ کتابچے بلوچی میں شائع کیے ہیں ۔

احادیث نبوی ﷺ کے تراجم پر مبنی ڈاکٹر ابوالقاسم عینی نے ''اربعین عینی'' بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع کرائی ہے ۔ نیشنل ہجرہ کونسل ، اسلام آباد نے ''رسالت مآب ﷺ ، نسب نامہ مبارک'' کو کتابی شکل دی ہے ۔ ''پاکیں نبی ﷺ ، نسب نانگ'' مرتب ومترجم ہیں ، آغا میر نصیر خان احمد زئی ، سیرت النبی ﷺ پر میر مٹھا خان مری کی تالیف محکمہ ، فلمز ومطبوعات حکومت پاکستان نے چھپوائی ہے ۔ نگرانی عبدالقادر اثیر

شاہوانی نے کی۔ جبکہ سیرت پاک ﷺ پر ایک اور کتاب "دو جہان سردار ﷺ" مومن بزدار نے مرتب کی ہے جسے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے شائع کیا۔ اسی نام سے مشابہ کتاب "سردار دو جہان ﷺ" قاضی عبدالرحیم صابر نے بلوچی ادبی بورڈ کراچی سے بہت پہلے شائع کرائی تھی۔ "ماہ میں راہ" نعتیہ کلام جناب ابراہیم عابد کی عقیدت مندی کا مظہر ہے۔ جناب پیر محمد زبیرانی نے شخ کتاب سے "کربلا" لے کر بلوچی میں منظوم ترجمہ کر کے بلوچی اکیڈمی سے چھپوائی ہے اسلامی جنگ ناموں سے منتخب رزمیہ کلام "رزم و رزمیہ" غوث بخش صابر نے ترتیب دی ہے۔ جب کہ فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن نے "کلام صوفیا" پر دو پاکستان کی چار زبانوں کے تراجم سے ترتیب دی۔ بشیر احمد بلوچ نے اس کا بلوچی حصہ بعد میں ترجمہ مرتب کیا ہے۔

مقالات ومضامین

بلوچی میں تحریری ادب کے ابتدا ہی سے زبان کی صحیح تفہیم، فقروں کی ساخت، محاورات کے استعمال کی اہمیت، املا کی اغلاط سے پاکیزگی موضوع بحث رہی ہے۔ شروع دنوں میں اچھے اچھے ادیب اور شعراء بھی بلوچی زبان کو صحت سے لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ جن اصحاب کو زبان پر تھوڑی قدرت تھی انہوں نے ان امور کا تجزیہ کر کے لکھنے والوں کی صحیح خطوط پر رہنمائی کی۔ ان میں کئی ایک بزرگوں کی خدمات بلوچی زبان و ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

بلوچی زبان میں متفقہ رسم الخط کا نہ ہونا، ابتدائی تعلیم سے محرومی، زبان کی ترویج و اشاعت میں جہاں بڑی رکاوٹ بنی رہی وہاں از خود بلوچی لکھنے والوں کے لیے مثالی تحریری زبان اختیار کرنے میں تردد اور تامل ناقابل فہم نہیں تھا۔ ان لکھنے والوں نے لہجوں کو زبان کا مقام دینا شروع کیا جس سے بھانت بھانت کے لہجے مشرقی اور مغربی بولنے اور سمجھنے والوں کے لیے پریشانی اور بددلی کا باعث بنتے رہے اور اب تک ایسے اثرات موجود ہیں کہ ایک متفقہ زبان ہونے کے بجائے لکھنے والے اپنے لہجوں اور علاقائی بولیوں کو زبان کا مقام دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی چند ایک ''زبان دوستوں'' کی خیر خواہانہ اور مصالحانہ کوششوں سے بلوچی زبان اپنے ساتھ کئی ایک لہجوں کو ہموار کر کے ترقی کے سفر پر مائل ہے۔ ان لکھنے والوں نے علاقائی اور لہجاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک حد تک متفقہ زبان کے لیے لائحہ عمل پیش کیا۔ ان لکھنے والوں میں سید ظہور ہاشمی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے ''بلوچی زبان ءِ سیاہگ'' لکھ کر اس معاملے میں اپنے طور پر بڑی مدد کی گو کہ انہوں نے ایک خاص علاقے کی زبان کو اختیار کرنے پر زور دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی، پنجگور، تربت اور مکران کے دوسرے علاقوں میں ان کی پیروی کی جانے لگی، آج خلیجی ریاستوں میں مقیم لکھنے والوں نے سید ہاشمی ہی کے رہنما اصول اپنا رکھے ہیں جبکہ کچھ اور علاقے جیسا کہ چاغی، خاران، قلات، مشرق میں مری بگٹی اور پنجاب میں ڈیرہ غازی خان کے لکھنے والے اپنے اپنے لہجوں میں لکھ رہے ہیں۔ مستقبل میں ہوسکتا ہے کہ زبان کے وسیع

تر مفاد میں زیادہ معروف لہجے ایک زبان میں ڈھل جائیں ایسے امکانات معدوم نہیں ہیں۔
زبان کی صحیح تفہیم کے سلسلے میں حاجی عبدالقیوم بلوچ نے ''بلوچی بومیا'' (رہنما) میں لکھنے والوں کو راہ دکھائی۔ وہ کتاب اب نایاب ہے ان کا اپنا ایک نقطہ نگاہ ہے جو سید ہاشمی سے حرف بحرف نہیں ملتا، اسی طرح کی کاوش پروفیسر عزیز محمد بگٹی اور آغا میر نصیر خان نے کی ہے جبکہ گرامر کا ایک ترجمہ جسے میجر ای موکلر نے بہت پہلے لکھا تھا۔ جناب محمد بیگ بلوچ نے ترجمہ کر کے لکھنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس میں ذرا بھر مبالغہ نہیں کہ زبان کے گیسو سنوارنے میں سب سے زیادہ اور مثالی کام ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے کیا ہے۔ جس میں بعض وجوہات سے اس ادارے کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں جہاں تمام علاقوں کے لکھنے بولنے والے آ کر تقاریر، خبروں، فیچر، ڈراموں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، عام گفتگو میں تحریروں میں ایک دوسرے کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ ہر چند کہ ریڈیو، زبان کی ترقی و اصلاح کے نقطہ نظر سے کام نہیں کرتا لیکن کچھ ایسے لوگوں کا ریڈیو سے منصبی تعلق رہا ہے۔ جنہوں نے شعوری طور پر زبان کی اصلاح اور مختلف لہجوں کے تال میل سے نسبتاً ایک علمی ادبی زبان کو رواج دیا۔ ان میں جناب بشیر احمد بلوچ، ملک محمد پناہ، عطا شاد، مرزا طاہر محمد، صورت خان مری، عبدالغفار خان، آغا محمد حسین اور دوسرے کارکنوں نے خلوص سے زبان کی تطہیر و تشکیل کا عمل جاری رکھا۔ شروع شروع میں مخلوط لہجوں سے مرتب بلوچی زبان کی تقاریر اور ادبی اصطلاحات یا سیاسی، اقتصادی، معاشرتی الفاظ پر اعتراضات ہوئے مگر اب اس قسم کے اعتراضات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور بلوچی کی علمی ادبی زبان ناقابل قبول نہیں رہی۔

بلوچی زبان میں آزاد جمالدینی کے جاری کردہ ماہنامہ نے ابتدا ہی سے شعر و سخن، داستان و افسانہ نویسی تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں دانشوروں کے زبان، نسل، تاریخ، ثقافت پر معلومات افزا مقالات بھی شامل رہے۔ ان لکھنے والوں میں میر شیر محمد مری، عبدالصمد امیری، اسماعیل امیری، حاجی عبدالقیوم بلوچ، میر مٹھا خان مری، عبداللہ جان جمالدینی، میر عاقل خان مینگل نے خامہ فرسائی کی ہے۔ بعد میں ماہنامہ ''السی'' ''نوکیں دور'' زمانہ، بلوچی دنیا، ملتان نے اس علمی کام کو اور آگے بڑھایا۔

بلوچی زبان بلاشبہ غلام حسین اور صبا دشتیاری کی ممنون ہے کہ انہوں نے کئی سالوں کی محنت شاقہ سے ایسے علمی مقالات کو مختلف رسائل و جرائد سے تلاش کر کے یکجا کرنے کے بعد ''بلوچی زبان و آ کبت'' میں چھپوا کر ان علمی ادبی اور تاریخی مقالات سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے، وہ ابھی اس کی دوسری جلد

ترتیب وتدوین میں مصروف ہیں۔اس تالیف کے دیباچے میں Anthropology اور زبان دانی کے سلسلے میں جناب صبا دشتیاری نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔

''انسانی زبان کی ابتدا کے باب میں شہرہ آفاق Anthropologist اور زبان دان Linguist جناب MaxMauller نے چار نظائر پیش کیے ہیں۔ پہلے نظریے کی بنیاد وہ قیاس وانداز ہے جس کی رو سے زبان میں نمائندہ الفاظ واشیاء میں ایک طرح کا قدرتی ربط وتعلق ہو، ہر چند کہ یہ خیال اس سے پیشتر یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے پیش کیا تھا، دوسرا نظریہ ''باؤواؤ'' Bow Vow کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے الفاظ کی آوازیں زبان کی بنیاد ہیں گویا الفاظ ایسی آوازوں کا نام ہے جو اشیاء کی نقل کرتے ہوں۔

جناب ملرن نے تیسرے نظریے کو ''پوہ پوہ'' کا نام دیا ہے وہ کہتے ہیں اس نظریے کی رو سے انسانی زبان کی ابتدا ایسے ارادے اور خود سر آوازوں سے ہوئی ہے جو ابتدائی زمانے کے انسان کے جذبات اور اظہار کے موثرات سے نکلے ہیں۔

چوتھا نظریہ ''یو۔ہیو۔ھو'' Yo -Heave- ho اس کے مطابق انسان کی اجتماعی وباہمی عمل کے موقع پر جیسا ختہ نکلتی ہوئی آوازوں سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

اس علمی اقتباس کے بعد فاضل دیباچہ نگار نے بین الاقوامی آثار و مستشرقین کے افکار واقوال کے حوالے دے کر اس کی روشنی میں بلوچی زبان کے نشو ونما اور ارتقا کا جائزہ لیا اس جائزے میں نہ صرف قیام پاکستان سے اب تک کے ملکی رویوں پر بحث کی ہے بلکہ ایران، افغانستان اور خلیجی ریاستوں میں بلوچی زبان اور ثقافت پر جو کچھ گزری یا گزر رہی ہے اسے بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔یہی وہ موثرات تھے جو مولف کو ''بلوچی زبان ءعاقبت'' کی ترتیب تالیف کے لیے سبب ترغیب ہوئے۔

جناب صبا دشتیاری نے اس علمی اور ادبی کام کی تکمیل کو کیوں ضروری سمجھا! اس کی وجوہات اور تحقیق و تدقیق کے مختلف مراحل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''زمانہ ماضی کے تغیر وتبدل کے طوفان زیادہ شدید نہیں ہوئے تھے اس لیے بلوچی زبان نے خود کو کسی نہ کسی طور پر بچائے رکھا ہے۔ حالانکہ محقق ودانشور خوب جانتے ہیں۔ بلوچی زبان خود کو پوری طرح بچا نہیں پائی ہے۔اس کی شعروشاعری اور ادب کا ساٹھ ستر فیصد حصہ وقت کے درندوں کی بھینٹ چڑھا ہے۔تاہم آج کے دور کے طوفانی تھپیڑے بہت بے رحم ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جن مضبوط قلعوں کی ضرورت ہے میں نہایت افسوس سے کہتا ہوں بلوچ قوم میں اس کا وجود نہیں اگر ہماری خودستائی اور بے

علمی پر فخر کا یہی عالم رہا تو زمانے کے ناقابل برداشت چانٹوں اور حملوں کا سامنا کر نہ سکیں گے اور خدانخواستہ ایسے صفحۂ ہستی سے محو ہو نگے کہ کوئی بتا نہیں سکے گا کہ اس سرزمین پر ایک ایسی قوم اپنے عظیم کلچر اور زبان کے ساتھ کبھی موجود بھی رہی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ بلوچی زبان کے مسائل و موانعات اور اس کے مستقبل پر خود ایک تحقیقی کتاب لکھوں اس کام کے لیے وقت، صلاحیتیں اور وسائل درکار ہیں۔ میں نے سوچا ایک طویل مدت تک تلاش و تحقیق کا انتظار کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ایسے دانشوروں کی تحریروں کو تلاش کر کے مرتب کروں جو زبان دوستوں کی اکثریت کی نظر سے اوجھل ہیں چنانچہ میں نے ''اومان'' سے لے کر بلوچی زبان میں جس قدر رسائل و جرائد دستیاب ہیں یا ایسا مواد جو کسی اور جگہ ہے ایک ایک کر کے جمع کرنا شروع کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہماری زبان کی پیش آمد مسائل و مشکلات پر جتنا کچھ علمی تحقیق کر کے ہمارے دانشوروں نے لکھا ہم نے ان کی اہمیت و افادیت کا کم ہی احساس کیا ہے اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ اگر آج کے قارئین کو اس اثاثے سے روشناس کرا سکوں تو یہ بھی ایک خدمت ہوگی۔

''اومان'' کے فروری ۱۹۵۱ء دسمبر ۱۹۹۳ء تک جتنے رسائل و جرائد شائع ہوئے تھے۔ میں نے ایک ایک کی تلاش جاری رکھی کم و بیش سات آٹھ مہینوں کی تلاش جستجو کے نتیجے میں مجھے بلوچی زبان کے معروف اور غیر معروف چھیاسٹھ ادباء اور ماہرین لسانیات کے ایک سو تیں مضامین کے حصول میں کامیابی ہوئی میرے لیے سب سے مشکل کام ان کو ترتیب دینا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ان مضامین کو ایسے مرتب کروں کہ بلوچی زبان کے بنیادی مسائل اور مشکلات ہر پہلو سے کھل کر قارئین کے سامنے آسکیں۔ ان مضامین کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے انہیں چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کی ترتیب درج ذیل طریقے سے کی۔

۱	حصہ اول	زبان
۲	حصہ دوئم	بلوچی زبان
۳	حصہ سوئم	بلوچی املا
۴	حصہ چہارم	بلوچی زبان کا مستقبل

حصہ اول

حصہ اول میں، میں نے کوشش کی کہ ان تمام مضامین کو یکجا کروں جو زبان کے بارے میں عمومی مباحث سے متعلق ہیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف زبانوں سے باہمی تعلق اور رشتہ کے بارے میں ہیں ایسا بھی نہیں کہ یہ حصہ ایسا ہے جس میں زبان کے عمومی مسائل ہی زیر بحث آئے ہیں بلکہ ایسے مضامین بھی ہیں جن میں بلوچی زبان کے سرچشمہ و ماخذ پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن وقت نظر سے دیکھا جائے تو اس حصے کے تمام تر مضامین کا معتدبہ حصہ اور مواد اس زبان کے عمومی مسائل و مشکلات کے بارے میں ہے۔

حصہ دوئم

حصہ دوئم میں وہ مضامین شامل ہیں جو خصوصیت سے بلوچی زبان کے بارے میں ہیں میری کوشش یہ رہی ہے کہ اس میں صرف وہ مضامین ہوں جو بلوچی زبان کی بنیاد اور نشو ونما کے بارے میں ہیں۔ تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں صرف بلوچی زبان ہی سے بحث ہو بلکہ ان میں چند ایک مضامین ایسے ہیں جن میں زبان کے ساتھ ساتھ ''املا'' کے مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان میں زیادہ تر مضامین بلوچی زبان کے بارے میں ہیں اس حصے میں اکثر ایسے فکر انگیز اور محنت شاقہ سے لکھے گئے مضامین ہیں جو قارئین کی نظر میں نہیں آ سکے ہیں اور ان اصحاب کے لیے مدلل جواب موجود ہیں جو بلوچی زبان کے بارے میں غلط سوچ رکھتے ہیں خواہ وہ مغربی ماہرین لسانیات ہوں یا پھر اردو کے متعصب اور خود ساختہ دانشور۔

حصہ سوئم

حصہ سوئم بہت طویل اور اہمیت کا حامل ہے اس میں زیادہ تر وہ مضامین ہیں جن کا تعلق بلوچی ''املا'' سے ہے اس حصے کے مطالعہ کے بعد لوگوں کو اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ ۱۹۵۱ء سے لے کر اب تک کم و بیش تمام نامور ادباء نے بلوچی املا کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھا ہے مجھے حیرت و افسوس ہے کہ اس قدر مضامین اور اس طرح کے افکار کے باوجود ہمارے لکھنے والوں نے اب تک اپنی زبان کے لیے ایک

معیاری رسم الخط اختیار نہیں کیا حالانکہ ان مضامین کی روشنی میں اگر لوگ جمع ہو کر مکالمہ و مذکرات کرتے تو ہماری زبان کے لیے املا اور رسم الخط کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا۔

مگر گری ہوئی بجلیوں کو کون سجائے

حصہ چہارم

حصہ چہارم جو آخری حصہ ہے اس میں وہ مضامین شامل کیے گئے ہیں کہ جس میں ہمارے بلوچ ادباء اور اہل قلم نے بلوچی زبان کے مستقبل سے متعلق اپنے اندیشوں کا اظہار کیا ہے۔ کہ ایسے مضامین بلوچی زبان کے خیر خواہوں کے لیے غور و فکر کرنے اور ترغیب کے مینار ہیں۔ اس طرح کے مضامین میں ہمیں امید کا سنہرا سورج، چمکتے ہوئے صبح درخشاں کی نوید دیتا ہے۔ جبکہ ناامیدی اور غیر یقینی کی سیاہ رات کے درندے کے جبڑوں کا احساس بھی ملتا ہے ان دونوں رنگوں کے باوجود ہم لکھنے والوں کی نیتوں پر کسی طرح کا شک اور گمان نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ انہوں نے یہ ساری تحریریں اپنے پاک دل کے جذبات کے اظہار میں لکھی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بات قبول کرنے پر بھی آدمی کا دل آمادہ ہوتا ہے کہ آج در حقیقت ہماری بلوچی زبان ان دونوں صورت ہائے احوال میں گھری ہوئی ہے۔ اس لیے امید اور خوش فہمی میں مبتلا ہو کر ایسے مضامین پر بغلیں بجانا، یا ناامیدی کا شکار ہو کر ایسے جذبات کو نظر انداز کرنا ہمارے لیے ہرگز بھی سود مند نہیں ہے اس لیے ہمیں اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں کے مطالعہ کے بعد حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کا راستہ منتخب کرنا چاہیے۔

''ان مضامین میں جیسے فکر و خیال ملتے ہیں وہ لکھنے والوں کے اپنے ہیں، البتہ کہ ان کو تلاش کرنے، جمع کر کے پیش کرنے میں مجھ سے کسی طرح کی سہو ہوئی ہے تو میری ایسی انسانی کمزوری کو نظر انداز کر دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے دانشور دوست، بزرگ اور ادب نواز مجھے اپنے بہترین مشوروں سے نوازیں گے جن کا میں دل سے خیر مقدم کروں گا۔''

''بلوچی زبان ءِ آ کبت'' میں حصہ اول و دوئم کے مضامین ایک نظر میں۔

حصہ اول	زبان
زبان پجاری ءِ چے انت	کریم بلوچ
حند ءِ اروپائی زبان	احمد
پہلوی زبان ءِ سر ءَ بن ودروشم	میر عاقل خان مینگل
زبان ءِ وودی بوتن	عبدالرحمٰن پہوال
انسانی زبانانی رودوم	رولا چو کالیدو / مترجم: ڈاکٹر بدل خان
ہمادی زبان ءِ دروشم	میر عاقل خان مینگل
زبان	انور شاہ قحطانی
کردگالی زبان ءِ آریائی درودشم	میر عاقل خان مینگل
گالانی بن دپتر	ع۔ص۔امیری
گالانی بن دپتر ءِ سرا چمشانکے	ع۔ص۔امیری
ماں سندھی ءِ بلوچی دروشم	گل محمد گل ملیری
طوروالی زبان	میر عاقل خان مینگل
جدید بلوچی الفاظ	مولانا خیر محمد ندوی
مادشاء بن ونچک	میر عاقل خان مینگل
بلوچی زبان ءِ جائزہ	عزیز اللہ عزیز
ایراد ءِ گروچیل	میر عاقل خان مینگل
حصہ دوئم	(بلوچی زبان)
بلوچی زبان	ع۔ص۔امیری
بلوچی وآسیائی زبانانی سیادی	میر عاقل خان مینگل
بلوچی زبان	انور شاہ قحطانی
بلوچی زبان وادب	سیّد ہاشمی
بلوچی زبان ءِ بن رودوم	م۔طاہر
نوکیں خیالے نوکیں زوانے	صورت خان مری
بلوچی زبان	اکبر بارکزئی / مترجم: عبدالغفار ندیم

بلوچی و پشتو	نیک محمد بزدار
بلوچی و پہلوی ءِ ہمتواریں	خالقداد آریا
لبز	مترجم: اشرف سربازی
بلوچی زبان ءِ مزن پہنادی	آغا نصیر خان احمد زئی
بلوچی ءِ سیالی	میر عاقل خان مینگل
بلوچی بجیر	عزیز محمد بگٹی
بلوچی زبان و کمران	عنبر پنجگوری
بلوچی براہوئی زبانانی ہمواریں تنگ	حاجی عبدالقیوم بلوچ
تاریخی ردی و نوکیں گال	غ۔ ص۔ امیری
بلوچی زبان	میجر موکلر / مترجم: محمد بیگ بلوچ
شاہیگانیں بلوچی زوان	انور روماں / مترجم: م۔ طاہر
بلوچی زبان ءِ سروبن الفبائن	اکبر بارکزئی
بلوچی زبان	محمد علی دہواری
بلوچی چہ فارسی ءِ کوھن ترانت	غوث بہار، جی آر گلاب
تو سارہ یا من سار آن	اکبر غمشاد

بلوچی ادب کی دیگر اصناف

لوک کہانی

لوک کہانیاں، لوک داستانیں اور لوک گیت دوسری زبانوں کی طرح بلوچی زبان میں بہت زیادہ ہیں جدید ادب کی تحریری شکل اختیار کرنے کے ساتھ ہی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس سرمایہ کی تلاش اور قلمبند کرنے کو اولیت دینی چاہیے بلوچی لوک کہانیوں میں بلوچ قوم کی ثقافت، تمدنی زندگی، معاشرتی خدو خال نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ تاہم لوک کہانیوں کے جتنے مجموعے اب تک مرتب ہو کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک آدھ کے سوا قارئین کی توجہ مختلف اسباب کی بنا پر جذب نہیں کر سکے۔ ان اسباب میں نصیمو علاقائی لہجوں کا بڑا دخل ہے اس اسٹیج پر ان لوک کہانیوں کو منتخب کر کے مرتب کرنا چاہیے تھا جو مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کی مرتبہ کتاب'' پاپولر پوئٹری آف دی بلوچ'' جلد اول میں جمع کی گئی ہیں۔ جناب ڈیمز نے ان کہانیوں کو رومن میں لکھا۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے معروف اہل قلم مرحوم ملک محمد پناہ کی مدد سے انہیں موجودہ رسم الخط میں منتقل کیا۔

لوک کہانیوں کے دیگر مرتبین جناب محمود مری، گلزار خان مری، امان اللہ غازی، میر عاقل خان مینگل، مومن بزدار اور اسحاق ساجد بزدار صاحبان ہیں۔

لوک داستان

لوک داستانیں اکثر و بیشتر منظوم صورت میں ہیں، حانی شئے مرید، لل ءُ گراناز، شیرین دوستین، مست توکلی سمو، جناب بشیر احمد بلوچ، میر گل خان نصیر اور میر مٹھا خان مری نے متعارف کرائی ہیں ان پر ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں جن کا ذکر ڈرامے کے عنوان تلے کیا جائے گا۔

افسانہ

۱۹۵۶ء میں ماہنامہ "بلوچی" کے اجرا کے ساتھ ہی بلوچی افسانہ نویسی کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دور میں میر شیر محمد مری، مراد ساحر، نسیم دشتی، طاروجی، قراۃ العین طاہرہ اور کچھ دوسرے لکھنے والوں نے افسانے لکھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچی میں افسانہ نویسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ماہنامہ "بلوچی" اور "الس" میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا بعد ازاں ایک مجموعہ "گچین از ماتک" کے نام سے جناب عبدالحکیم بلوچ نے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع کرایا وہ اس مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"انسانی شعور نے ہر دور میں زندگی کی عکاسی کی ہے۔ زندگی کو اپنے وقت کے آئینے میں، اس دور کی معاشرتی اور سماجی ضرورتوں کے تابع دیکھا ہے۔ زندگی اور ماحول میں کئی ایک چیزوں میں نئے نئے رشتے تلاش کیے ہیں اس طرح ادب وفن کا ایک جہاں بسایا ہے۔"

ایک دور تھا جب بڑی بوڑھیاں اپنے پیارے دلارے پوتوں پوتیوں کو بہلا کر سلانے کے لیے سرما کی برف پاش اور گرما کی چاند سے نہائی راتوں میں دیووں اور پریوں کے قصے کہانیاں سنایا کرتیں، شعراء اپنی نظموں میں قبائلی سورماؤں کا بیان کرتے نغمہ گر اور مطرب سازوں کی لے پر مبہوشوں کی ستائش میں راتیں بتا کر صبح کرتے۔ یونانی افسانہ نگاروں نے خود ساختہ دیوتاؤں کی کہانیاں لکھ کر دنیا کو ایک زندہ جاوید فن سے روشناس کرایا جن کے خزائن صدیوں کے دست برد کے باوجود ختم ہونے میں نہیں آتے۔ "پرامیتوس" نے چنگاری چرا کر انسان کے حوالے کی اور اپنے دیوتاؤں سے دغا کا مرتکب ہوا۔ مگر محنت کشوں کو اکتساب کی دوامی دولت سے مالا مال کیا۔ اسکا "سیلس" نے اس کہانی سے یادگار ڈرامہ تیار کیا جس سے یونانی شہریوں کو مسرت حاصل ہوئی مگر۔۔۔ چرائی ہوئی چنگاری نے انسانی شعور پر جمی ہوئی برف پگھلا ڈالی۔ حیات و کائنات کی نقل کو نیا انداز نصیب ہوا۔ محنت کش اور لوہار کی اس چنگاری سے کارخانوں میں روشنی کی مطبع اور پریس کا چلن ہوا۔ یوں لکھنے والا امراء کے محلوں سے نکل کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا۔

کہانی شاعر اور مطرب کے ہاتھوں سے نکل کر نثر نگار اور ناول نویس کے ہاتھ لگی جس نے طویل کہانیوں کے روپ میں ناول لکھے اور زندگی کی بھرپور سرگرمیوں کی تجسیم کی یہ صنف ادب جوان ہوئی

تو فنی انقلاب بھی اپنے عروج پر آیا۔اس انقلاب نے انسانوں کی مصروفیت ایسے بڑھائی کہ لوگوں کے لیے طویل ناول کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا۔نثر نویس کی دلچسپی اس صنف میں گھٹنے لگی ،ادبی جرائد و رسائل میں ادبی کہانیوں میں حیات نے ایک نئی کروٹ لی ،یوں ادب میں افسانہ نویسی کو شکل مل سکی۔

یورپی ادب اپنے نئے نئے انداز لیے ہندو پاک میں آپہنچا یہاں ہندی اور اردو زبانوں نے اسے پوری طرح اپنایا۔پورے ملک میں ناول اور افسانہ کا چلن عام ہوا۔اردو اور ہندی میں بھی یورپ کے زبانوں کی طرح اچھے اچھے افسانے لکھے گئے۔

بلوچ نوجوان جب دیہی زندگی سے نکل آیا۔ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچا اسے نئے ادب سے تحریک ملی ،دوسری جانب سیاسی افکار سے متاثر ہوا ،انہی دنوں آزادی کی تحریکوں نے انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا ،آزادی حاصل ہوئی ،آزادی کے ساتھ ہی جمہوریت ،ثقافتی ترقی ، اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق قرار پایا جو جمہوری پیش رفت ،آزادی اور ترقی کا لازمہ ہے۔

بلوچ قوم کے خواندہ افراد کے دلوں میں بھی اپنی زبان وثقافت کی ترقی اور دوسری زبانوں کی سطح پر لانے کا جذبہ ابھرا آزادی کے کچھ ہی سال بعد چند سرپھروں نے کراچی سے ماہنامہ ''اومان'' جاری کیا۔ ''اومان'' کے اجرا کے ساتھ ہی قصہ کہانی داستانگیری ،شاعری کا صرف حق نہ رہا اب اس میں خواندہ اور نیم خواندہ بلوچ افسانہ نگاروں ڈرامہ نویسوں نے بھی حصہ لینا شروع کیا۔

ماہنامہ ''بلوچی'' کراچی کے اجراسے بلوچی افسانہ شباب پر آیا اور ماہنامہ ''الس'' کی اشاعت پر بلوچی افسانے نے ترقی کی جانب قدم بڑھائے اس میں نئے نئے خیال اور جوان امنگوں نے جگہ پائی۔افسانے کا یہ سفر اب تک جاری ہے۔گو بلوچی افسانہ اب تک دنیا کے بہترین افسانوں کی ہمسری نہیں کرسکتا مگر دس پندرہ سالوں کی اس مدت میں ہمارے افسانے نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔(یہ کتاب جس میں جناب عبدالحکیم بلوچ نے پیش لفظ لکھا ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ گذشتہ پچیس سالوں میں خاصی پیش رفت ہوئی)اس ترقی کی کہانی افسانوں کے اس انتخاب میں نمایاں نظر آتی ہے۔

جناب عبدالحکیم بلوچ نے بلوچی افسانوں جو مجموعہ شائع کیا تھا وہ اس جانب پہلا قدم تھا۔''گچین از مانک'' دو حصوں پر مشتمل تھی۔پہلے حصے میں بلوچی زبان کے کہنہ مشق اہل قلم نے غیر ملکی زبان کے تراجم کر کے ..بت کیا تھا کہ بلوچی زبان غیر ملکی ترقی یافتہ زبانوں کے خیالات کو خود میں سمیٹنے کی اہلیت کی

حامل ہے، چیخوف، گورکی، ولیم سرائن، موپاساں، ژاں پال سارتر، سمرسٹ ماہم، ای وی لوئس، نمینکو ے ایکس برانڈ، کرشن چندر، یوسف سباعی اور نذر الاسلام کے افسانوں کا کامیاب ترجمہ کیا گیا۔ اسی کتاب کے دوسرے حصے میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کے بلوچی طبع زاد افسانوں کا انتخاب ہے بلوچی زبان کے ممتاز لکھنے والوں نے بلوچی افسانے کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ان افسانہ نگاروں میں شیر محمد مری، ط۔ روحی، مراد ساحر، نسیم دشتی، کریم دشتی، نعمت اللہ گچکی، گلزار خان مری، م۔م۔ طاہر، قرۃ العین طاہرہ، ایم بیگ، عبدالغفار گچکی، عبدالرحمن غور، برکت علی بخبر پنجگوری، عصمت اللہ خان جمالدینی، صورت خان مری کے افسانے قابل ذکر ہیں۔

''گچین از مانگی'' تین سال بعد ۱۹۷۳ء میں راقم نے بلوچی افسانوں کے تراجم پر مشتمل ایک اور مجموعہ شائع کیا، مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے افسانوی تراجم کو اس کے معنوی نسبت سے ''ملگزار'' کا نام دیا جس کے معنی ہیں مرغزار۔

ملگزار میں قومی زبان اردو کے علاوہ پاکستانی زبانوں جیسے کہ بلوچی، کشمیری، براہوئی، پنجابی، سندھی، پشتو کے افسانوں کے ساتھ بنگالی، ملائی، مدراسی، فارسی، ترکی، عربی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن اطالوی، بلغاری، چینی، جاپانی، چیک سلوانی، گجراتی، انڈونیشی، مصری اور روسی زبان کے منتخب افسانوں کے بلوچی میں تراجم شامل کیے گئے ہیں۔

بلوچی افسانے نے اس مختصر عرصے میں اگرچہ قابل لحاظ ترقی کی ہے لیکن اس نے بہت سے نشیب و فراز بھی دیکھے ہیں۔ کچھ افسانہ نگار زندگی کی بازی ہار کر ہم سے بچھڑ گئے جبکہ کچھ کی مصروفیات آڑے آئیں، لکھنے والوں میں دو ایک کا اضافہ بھی ہوا ہے مگر جیسے کہ کتاب کے ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ شاعری کے مقابلے میں نثری ادب تخلیق کرنے کا رجحان کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا تاہم ایسا بھی نہیں کہ مختلف اصناف پر مناسب کام نہ ہوا ہو۔ تحقیق، تاریخ و تدریس کی کتابوں کے ساتھ افسانوں کے چند مجموعے بھی ملتے ہیں ہر چند کہ شعری مجموعوں کے مقابلے میں کم ہیں مگر جس قدر ہیں وہ خوب ہیں اس لیے کہ ابتدائی دور میں اس سے افسانہ نویسی کے فن اور اس کے ذریعے معاشرے کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

بلوچی زبان کے افسانے اپنے معاشرتی محور کے گرد گھومتے ہیں، موضوعات میں ابتدائی دور کے افسانوں میں غربت، پسماندگی، ناخواندگی، طاقتور طبقات کا کمزوروں کا استحصال، قبائلی مزاج اور علاقائی مسائل نمایاں ملتے ہیں، خصوصاً میر شیر محمد مری، آزاد جمالدینی، مراد ساحر نے شروع دنوں میں جو

افسانے لکھے ان میں دیہی زندگی شرح صدر کے ساتھ موجود ہے۔ بعد میں جناب عزیز محمد بگٹی اور منیر عیسیٰ کے افسانے پڑھنے کو ملے۔ عزیز محمد بگٹی نے ''نود و رگام'' میں جس طرح اپنے علاقے کے کلچر کی نشاندگی کی ہے بالکل اسی طرح جناب منیر عیسیٰ نے ساحلی علاقوں کے بود و باش کو موضوع بنایا ہے۔ عزیز محمد بگٹی نے ''نودورگام'' کے سترہ افسانوں میں قریب قریب دس افسانوں میں قبائلی علاقوں کے کلچر کو ابھارا ہے، افسانوں کے نام سے ان کے موضوعات کا پتہ چلتا ہے۔ شوانگ (چرواہا) را ہگی (ہاری) پنڈوال (دیہاتی) ''دس مئے بیوی ایں'' ہمارا اختیار بے بسی ہے۔ مزدوری، فریب وغیرہ۔ نودورگام کے افسانوں کے مجموعے کا پیش لفظ نواب محمد اکبر خان بگٹی نے انگریزی میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ نواب صاحب عزیز محمد بگٹی کی تقریباً ہر کتاب کو یہ عزت بخشتے آئے ہیں۔ بلوچی ادب کے لیے یہ مبارک اقدام ہے۔ عزیز محمد بگٹی کے علاوہ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی، منیر عیسیٰ صدیق آزاد، طاہر محمد، عبدالحکیم بلوچ کے افسانے بلوچی زبان کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ سید ظہور شاہ ہاشمی نے بھی افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اگر چہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ چھپا بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی بلوچی کے معروف افسانہ نگاروں میں سے ہیں تاہم ان کا مجموعہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ منیر عیسیٰ یوں تو دوسری اصناف میں بھی دخیل ملتے ہیں مگر حقیقتاً ان کی شہرت افسانہ نویسی ہے۔ منیر عیسیٰ نے اب تک تین مجموعے ''نودی شل'' ''کپند'' اور ''گرکی تل'' شائع کیے ہیں۔ ''نودی شل'' بر وقت دستیاب نہیں ہو سکا، ''کپند'' میں بارہ افسانے جبکہ ''گرکی تل'' میں بائیس افسانے ہیں۔

جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا چونکہ منیر عیسیٰ کا تعلق بلوچستان کے ساحلی علاقہ سے ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں کی وساطت سے ساحلی علاقوں کی زندگی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ واقعی شارٹ سٹوری لکھتے ہیں عام طور پر ایک نادیدہ احساس پر کہانی مبنی ہوتی ہے بیان میں سادگی اور روزمرہ کی زبان ان کا خاصہ ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے بلوچی افسانوں میں نئے نئے خیالات کو روشناس کرایا گیا ہے۔ اگر چہ علاقے کے عوام کے مسائل اب بھی افسانوں کی بنیاد بن رہے ہیں مگر وہ عمومی محرومیاں، وہ مصائب اب صرف بیان تک محدود نہیں بلکہ ان میں شعور کا احتجاج، سوچ کی مزاحمت واضح طور پر ملتی ہے ''زرگوات'' جناب غوث بہار کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے جو انہوں نے پس دیوار زندان تخلیق کیے۔ اس مجموعے میں شامل ''محشر'' کا اردو ترجمہ جناب غنی پرواز نے اکادمی ادبیات پاکستان کے سہ ماہی رسالہ کے لیے کیا جو سالنامے میں شامل ہے۔ اس سے غوث بہار کی وہ سوچ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ بلوچی

افسانے کو فکر و فن کی نئی راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں زر گوات کے اس مجموعہ کا پیش لفظ بلوچی کے مایہ ناز دانشور میر امان اللہ گچکی نے لکھا ہے۔غوث بہار جو خود بھی ایک ترقی پسند شاعر اور ادیب ہیں۔ان کا انداز بیان ایک پسندیدہ جدت کا حامل ہے اگر چہ ان کی نگارشات شدت احساس کی تلخی سے بعض اوقات بوجھل ہوتی ہیں۔مگر ان کی بنیادی وجوہات سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ان دنوں جناب رزاق نادر شعر گوئی کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کی جانب بھی متوجہ ہیں ان کے افسانے بھی چونکا دینے والے ہیں۔تاہم غنی پرواز کے افسانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس فن میں قدامت پرستانہ خیالات کو ترک کرتے ہوئے بلکل نئی راہیں اپنائی ہیں۔وہ زندگی کو باری (کسان) اور مزدور کی کٹیا میں تو دیکھتے ہیں مگر اسے متوسط اور متمول گھرانوں میں جھانک کر وہاں کی انوکھی طرز معاشرت کے تجزیے کا بھی خیال رہتا ہے۔زندگی کے کئی رخ ہیں اور ہر پہلو سے اس کے مشاہدے سے ہی افسانہ نگار کے فن کو قبولیت حاصل ہوتی ہے۔غنی پرواز کے افسانوں کا مجموعہ "سائکل" کے نام سے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے اہتمام سے چھپا ہے۔

جناب صبا دشتیاری نے "ہون ءِ شام" کے نام سے حال ہی میں اپنے افسانوں کا مجموعہ عزت اکیڈمی، پنجگور کی وساطت سے شائع کیا ہے۔صبا دشتیاری کو ادب کے تقریباً تمام اصناف پر دسترس حاصل ہے۔وہ ایک ذہین اور طباع دانشور ہیں ان کا مطالعہ گہرا اور شعور پختہ ہے۔یہی وصف "ہون ءِ شام" کے افسانوں کا ہے۔غنی پرواز کی کتاب "سائکل" اور صبا دشتیاری کی کتاب "ہون ءِ شام" کو اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔

ڈرامہ

ارسطو کا بیان ہے کہ انسان اس وجہ سے دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقالی کرتا ہے۔اسی جبلت کے سبب سب سے پہلے تعلیم پاتا ہے۔دانشوران ادب کے نزدیک یہی قدیم ترین طرز عمل ڈرامہ کی بنیاد ہے۔ڈرامہ کی روایت اسی قدر قدیم ہے جتنا کہ انسان خود۔اس قول کی صداقت سے انکار نہیں۔ڈرامہ خود یونانی لفظ Droemon سے اخذ ہے ہر مذہب ہر قوم اور ہر ملک میں ڈرامے کی روایت عہد قدیم ہی سے موجود ہے۔یونان، ہندوستان، چین، جاپان، اٹلی، جرمنی اور انگلستان میں قدیم سے یہ روایت موجود ہے۔ایک حوالہ ایسا بھی ملتا ہے کہ ولیم شیکسپیئر جن کے ڈراموں کو

عالمی شہرت حاصل ہے۔ قدیم قصوں اور کہانیوں کو ڈراموں کے قالب میں ڈھالتا رہا۔ بلوچی میں ڈرامے
کی اصل بھی قدیم قصے کہانیوں سے اخذ ہے یہ دعویٰ کیا جائے کہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں بلوچی
ڈرامہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے مکالمے کلاسیکی دور سے منظوم ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ بلوچی کی
رزمیہ اور عشقیہ داستانیں ڈرامہ کی قدیم ترین شکل ہے اس میں راوی، کردار ہر ایک نظم میں اظہار خیال
کرتا ہے۔ حانی شئے مرید، بی برگ گراناز، شہداد مہناز، حمل و ماہ گنج، کیا اور صدو، لل ءُ گراناز، بالاچ گور
گیر، جنگ نلی، دوستین شیرین، ان تمام داستانوں کا مواد ڈرامہ کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ نمونے کے طور
پر شہداد مہناز کی داستان سے چند مکالمے پیش کیے جاتے ہیں۔

شہداد عومر یک بیتارے گلم گوشیں
وار تگے ڈونڈ ءِ روت ہما ہونڈ ءَ
گوں دپ ءِ سونڈار ءِ نراز ین آ
سیہ سریں مجے مودے پاشاناں
بابزدلونگاں لپاشان ءِ

مہناز عومر مئے بگ ءِ برگیں ساندانت
شرگچینگ ءِ کوچگاں چتر تہ
سر مہارے آبرشیمیں ستہ
برجن ءِ چیں زاں سر نشتہ

شہداد زوت بکن استابرات بجن نالاں
بور شپادانت اوکار منا بازاں

استا بور شپادانت نیں کارتی بازاں
ستکہ ترا مہاناز ءِ جل ءِ زراباں

موجودہ دور میں جب بلوچی زبان نے تحریری شکل پائی ان داستانوں کو بنیاد بنا کر ریڈیو، ٹی وی اور
رسائل و جرائد کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے گئے اور اب تک لکھے جارہے ہیں۔

بلوچی ادب کے ابتدائی دور میں جب بلوچ عوام میں اپنی زبان اور ثقافت کو ترقی دے کر بروئے کار
لانے کا احساس جاگا تو بلوچی کے اولین اسٹیج ڈرامہ نے ہراول دستہ کا کام کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں مستونگ
کے مقام پر ایک ثقافتی جشن کو اسٹیج ڈرامہ ''شہناز'' نے جنم دیا تھا، اس دور کی فوجی حکومت ایجنسیوں کی
انگشت پر اس کے منتظمین کی تادیب اور گوشمالی کر کے اس علاقے میں عوام میں غیر مقبول بن گئی تھی۔ یہ

ایک طول وطویل کہانی ہے جس میں سیاسیات کے ڈانڈے ملے ہیں۔حاصل کلام یہ کہ ڈرامہ کے ذریعے بلوچی زبان کو ترقی کی راہ زینہ بہ زینہ ملی۔

ڈراموں کی مقبولیت میں اہم ترین حصہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا ہے۔۱۹۵۶ء میں جب یہ نشرگاہ قائم ہوئی یہاں سے بلوچی زبان میں ڈرامے نشر ہونا شروع ہوئے۔ ہر تغیر و تبدل کی پشت پر کچھ فعال شخصیتیں ہوا کرتی ہیں یہ بلوچی زبان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بشیر احمد بلوچ جیسے دانشور کی سرپرستی حاصل ہوئی اور میر امان اللہ گچکی، عطا شاد، ایوب بلوچ، عبدالحکیم بلوچ، کریم دشتی، نصیر شاہین، صورت خان مری اور غوث بخش صابر جیسے معاونین میسر آئے۔ریڈیو ڈراموں نے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک دھوم مچائی۔ بشیر احمد بلوچ خود بھی اچھے ڈرامے لکھتے رہے تھے۔عطا شاد، امان اللہ گچکی اور دوسرے لکھنے والوں نے ڈرامہ کے حوالے سے بلوچی زبان کو مالا مال کر دیا تھا۔عطا شاد کو ڈراموں کی پروڈکشن میں ید طولیٰ حاصل تھا انہوں نے بلوچی ڈراموں کی مقبولیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔

بلوچستان میں ٹیلی ویژن ۱۹۷۴ء میں آیا۔زبان کی ترقی میں ٹیلی ویژن کا بھی حصہ ہے۔لیکن اس کی ناقابل فہم پالیسیاں اکثر زبان کی پیش رفت میں آڑے آتی رہیں۔

باوجود اس کہ بلوچی زبان کے تمام لکھنے والوں کی رفاقت حاصل ہے۔لیکن وہ شہرت جو پروگراموں کے حوالے سے ریڈیو پاکستان کوئٹہ کو حاصل ہوئی اس کا عشر عشیر بھی ٹیلی ویژن کے حصے میں نہیں آیا۔

بلوچی میں ڈرامہ، فیچر اور تقاریر ریڈیو پاکستان خضدار اور تربت سے بھی نشر ہوتی ہیں۔حصہ بقدر جثہ ہر ادارہ اپنا کام احسن طور پر کر رہا ہے۔ان اداروں کی توجہ سے بلوچی زبان و ادب کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور مستقبل میں پہنچ سکتا ہے۔

ناول

بلوچی میں ناول بہت ہی کم لکھے گئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بلوچی زبان و ادب سے وابستہ اداروں اور اہل قلم کا یہ خیال ہے کہ اس مرحلے پر ناول لکھنے سے بلوچی زبان کے بنیادی تحقیقی امور میں خلل ہونے کا اندیشہ ہے۔یہ سعی کی جارہی ہے کہ بلوچی شعر و ادب کا جو سرمایہ سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ پرانے لوگوں کے اٹھ جانے سے یہ اثاثہ ضائع ہوگا ناول تو بعد میں لکھے جاسکیں گے مگر شعر و ادب تاریخ و ثقافت کے جو جواہر پارے سن رسیدہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں ان کے رخصت ہو جانے کے بعد ان کا حصول ممکن نہ رہے گا۔چنانچہ بلوچی زبان و ادب میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

ان میں معتد بہ تعداد قدیم قصص، قدیم اشعار اور تاریخی واقعات وداستانوں پر مشتمل ہے یہ وہ بنیادی کام ہے جو ناول نویسی کی راہ میں مانع ہے۔ اس کے باوجود دو ایک ناول لکھے گئے سب سے پہلا ناول ''نازک'' سید ظہور شاہ ہاشمی نے لکھا جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس ناول کا اردو ترجمہ غوث بخش صابر نے کیا۔ جسے اکادمی ادبیات نے شائع کیا ہے۔ ایک ناول ''مل ءتوار'' فقیر محمد عنبر نے لکھا جسے سر چمگ لوزانکی مجلس پنجگور نے شائع کیا، ناقدین کا خیال ہے کہ یہ ناول کی تکنیکی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔
منیر احمد بادینی نے ایک مختصر سا ناولٹ ''ریکانی تل ءھلکے'' لکھا جو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع ہوا بلوچی ادب میں اب وہ مرحلہ آچکا ہے کہ جملہ اصناف کی طرف توجہ دی جائے امید ہے کہ لکھنے والے اب ناول لکھنے کی جانب بھی توجہ کریں گے۔

تنقید

بلوچی ادب میں تنقید کا خانہ تقریباً خالی ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بلوچی زبان وادب میں نقادوں کا وجود مفقود ہے بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ تنقید سے شعوری طور پر اس لیے احتراز کیا جاتا رہا ہے کہ بلوچی زبان کا ادب ابھی نو وارد ہے۔ تنقید کرنے سے لکھنے والوں کی کہیں حوصلہ شکنی نہ ہو جائے۔ اگرچہ اس احتیاط سے یہ ہرج ہو رہا ہے کہ بلوچی ادب ان خطوط پر گامزن ہونے میں مشکلات کا سامنا کر رہا ہے کئی ایک اچھے شاعر ہیں جو فن عروض تو رہا اپنی جگہ اوزان وبحور سے بھی صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ دوسری اصناف میں بھی بہت سے لکھنے والے پوری طرح شد بد نہیں رکھتے۔ گذشتہ پچاس سالوں میں صرف دو ایسی کتابیں سامنے آسکی ہیں۔ جن کا تنقید سے تعلق ہے۔ پہلی کتاب ''شر گداری'' ہے جو محترم کریم دشتی نے ۱۹۶۲ء میں لکھی، یہ دراصل ریڈیائی تقاریر پر مبنی تھی جو انہوں نے وقتاً فوقتاً نشر کی تھیں۔ اس کتاب سے اس قدر رہنمائی ملتی ہے کہ ''اچھا شعر'' کیا ہے ''اچھی تحریر'' کیا ہے۔ مگر یہ کتاب اب خال خال ہی کسی کے ہاں دستیاب ہے۔ تنقید سے صرف نظر کا یہ عالم ہے کہ لفظ تنقید کے لیے لکھنے والے مختلف ہم معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسا کہ سرگداری، ایرادگیری، جہل جنگ، نگدکاری وغیرہ۔
تنقید پر دوسری کتاب ۱۹۹۰ء میں بلوچستان یونیورسٹی میں بلوچی زبان کے پروفیسر میر عاقل خان مینگل نے تصنیف کی ہے جسے انہوں نے لوزانکی ایرادگیری (یعنی ادبی تنقید) کا نام دیا ہے۔ فاضل نقاد نے انگریزی اردو اور دوسری زبانوں کے حوالے سے تنقید کی مختلف صورتوں کو متعارف کرایا ہے۔ اس

میں جوانوکھی بات ہے وہ کریم دشتی کی تنقید پر عطا شاد کی شاعری کے حوالے سے جوابی تنقید ہے۔ان دونوں نقادوں کے تقابل کی اہلیت راقم میں موجود نہیں البتہ ایک قاری کی حیثیت سے اس کا تاثر کا اظہار غیر ضروری نہیں کہ فاضل پروفیسر کی زبان اور فن تنقید میں غیر مانوس اصطلاحیں نا قابل فہم ہیں۔خصوصاً جب کہ یہ یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں بھی شامل ہے۔طلباء اس سے حقیقی معنوں میں استفادہ نہیں کر سکتے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ بہت سے زبان دان اور ادب پر دسترس کے مالک ادباء اور شعراء نے تنقیدی مضامین سپرد قلم کیے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان لکھنے والوں میں میر امان اللہ گچکی، عبدالصمد امیری، میر عبداللہ جان جمالدینی، پروفیسر صبا دشتیاری، ڈاکٹر فضل خالق، جی آر ملا، ظفر علی ظفر، صدیق آزاد اور میر مٹھا خان مری شامل ہیں۔

موجودہ وقت میں بلوچی اہل قلم کا یہ اصرار ہے کہ تنقید ضرور ہونی چاہیے تاکہ جو کچھ تخلیق کیا جارہا ہے اسے صحیح علمی اور ادبی مقام ملے اس لیے کہ بلوچی زبان کے ادب پر اب نصف صدی گزر چکی ہے اسے ہمعصر زبانوں کی صف میں تب ہی ممتاز مقام حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کا دامن ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہو۔

سیمینار

بلوچی زبان وادب کی ترویج وپیش رفت اور پیش آمد مسائل ومشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سیمینار بھی ہوتے رہے ہیں اور قابل اطمینان ہے یہ بات کہ کچھ سیمینار میں غیر ملکی دانشور اور محققین نے بھی شامل ہو کر صحیح رہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلا سیمینار نیپ کی حکومت کے دور میں میر گل خان نصیر کی کوششوں سے دو روز کے لیے کوئٹہ میں طلب کیا گیا۔ میر گل خان نصیر ان دنوں بلوچستان کے وزیر تعلیم تھے، سیمینار میں بحث ومباحثہ کا بنیادی مسئلہ بلوچی کے لیے ایک معیاری رسم الخط اختیار کرنے کا تھا۔ کچھ احباب چاہتے تھے کہ رومن رسم الخط اختیار کیا جائے جب کہ دوسروں کی رائے تھی کہ عربی فارسی سے اخذ کردہ رسم الخط اس لیے انسب ہے کہ اس طرح جس خطے میں بلوچ قوم بس رہی ہے وہاں کی تمام زبانوں میں انہی زبانوں کے مشابہ رسم الخط اختیار کیا گیا ہے، اس طرح مکتبہ فکر کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ رومن رسم الخط اختیار کر کے ناخواندہ معاشرے میں جس قدر کام ہوا ہے اس کا اثر بھی جاتا رہے گا اور مذہب سے فصل ہونے کا بھی اندیشہ ہے، یہ سیمینار بغیر کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہوا اور رسم الخط پر آج تک کوئی متفقہ فیصلہ ہونا باقی ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے بھی ایک دوروزہ سیمینار منعقد کیا تھا اس میں کئی ایک غیر ملکی سکالر مدعو تھے انہوں نے بلوچی زبان وادب کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے فیض اثر خیالات سے سامعین کو نوازا۔ ملک کے چاروں صوبوں سے مختلف زبانوں نے اسکالر جن میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سجاد حیدر، پریشان خٹک وغیرہ شامل تھے۔ اپنے گرانقدر مقالات پیش کیے بلوچستان کے مرکزی شہر میں علم وادب خصوصاً بلوچی زبان کے حوالے سے اس طرح کا علمی ادبی اجتماع منتظمین کے حق میں لائق ستائش رہا۔

تیسرا سیمینار بلوچستان کے قدیم ترین مرکز کیچ (تربت) میں ریڈیو پاکستان تربت کی تیرویں سالگرہ ۴ جنوری ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان اور ادارہ ثقافت بلوچستان کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ جس کا عنوان تھا ''کیچ ایک بازیافت'' اس سیمینار کے روح رواں سیّد عابد رضوی صاحب تھے جو قلم قبیلہ کے

دارالمبام اور ریڈیو پاکستان تربت کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ سیمینار میں غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ نے بھی حصہ لیا۔ فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر رولینڈ اور اطالون ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ولیریا نے کیچ کی قدامت پر مقالے پیش کیے جبکہ ڈاکٹر بی بخش خان بلوچ، میر بشیر احمد بلوچ، عطا شاد، عبدالغفار ندیم، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر منیر احمد بلوچ، پروفیسر غنی پرواز اور جناب افضل پرویز نے بلوچستان اور بلوچی کے اس مایہ ناز تاریخی مقام کو مختلف عنوانات کے تحت خراج تحسین پیش کیا۔ صوبائی وزیر اطلاعات کھیل و ثقافت میر محمد اکرم بلوچ نے صدارت فرمائی اور ڈاکٹر عبدالمالک وزیر تعلیم بلوچستان مہمان خصوصی تھے۔ عنوانات مندرجہ ذیل تھے۔

کیچ (کلیدی خطبہ)	ڈاکٹر این اے بلوچ	کیچ ایک تاریخی گزرگاہ	عبدالغفار ندیم
کیچ کے آثار قدیمہ	ڈاکٹر رولینڈ	کیچ تاریخ آئینے میں	ڈاکٹر منیر احمد بلوچ
کیچ میں اسلام کی آمد	مولانا عبدالحق	کیچ کے آثار قدیمہ	پروفیسر ولیریا
کیچ پنجابی شاعری میں	افضل رضا	کیچ سرزمین شعر ونغمہ	عطا شاد
کیچ کے نامور شعراء	بشیر احمد بلوچ	کیچ کی رومانی داستانیں	پروفیسر غنی پرواز

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا ہوگا کہ ادارہ ثقافت سرگرمیوں کے فروغ میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے وہاں اس نے ادبی سرگرمیوں میں اپنی تمام تر صلاحیتیں اور وسائل کا استعمال کیا ہے ادارہ ثقافت سے دو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ایک بلوچ لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ جسے بشیر احمد بلوچ نے لانگ ورتھ ڈیمز کے مجموعے سے لے کر شائع کیا ہے اور دوسری کتاب میر گل خان نصیر کی مثنوی ''شیرین و دوستین'' کا اردو ترجمہ ہے جسے راقم نے اردو میں منظور کیا۔

ادارہ ثقافت نہ صرف متوفی ادباء اور شعراء کی یاد میں ان کے دن مناتا ہے، ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ شامیں گزارتا ہے۔ بلکہ قومی موقعوں پر قومی اور پاکستانی زبانوں میں مشاعرے منعقد کراتا ہے اور فنکاروں اور موسیقاروں کو متعارف کرانے کے لیے محافل موسیقی منعقد کراتا ہے۔ بلاشبہ علمی، ادبی اور ثقافتی گہما گہمی کوئٹہ اور دوسرے شہروں میں اس ادارے کے دم سے قائم ہیں۔

پاکستان اور مشاہیر پاکستان

بلوچی زبان وادب کے گزرے ہوئے پچاس سالوں میں پاکستان اور مشاہیر پاکستان پر سرکاری میڈیا سے قطع نظر بہت کم لکھا گیا وجہ یہ نہیں کہ اس صوبے کی سب سے بڑی زبان کے لکھنے والوں میں ملک وقوم کی محبت کی کمی ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ قومی اشاعتی اداروں نے بلوچی زبان کو یکسر نظرانداز کرنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ بلوچستان میں اول تو ایسے ادارے نہیں ہیں ۔ اگر محدود پیانے پر کام کرنے والے ادارے ہیں بھی تو ان سے عدم استطاعت کی وجہ سے ایسے کاموں کی امید نہیں کی جاسکتی۔ جبکہ کراچی میں قائد اعظم اکیڈمی ،لاہور میں علامہ اقبال اکیڈمی نیشنل بک فاؤنڈیشن نیشنل بک کونسل ،اسلام آباد میں لوک ورثہ،فوک لوراور کتنے ہی ادارے موجود ہیں وہ تحریک پاکستان، قائداعظم، علامہ اقبال اور قابل قدر پاکستانی ہستیوں کے بارے میں بلوچی زبان میں کام کرانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود جب تک ''الس'' کا سرکاری پرچہ موجود تھا بلوچی میں پاکستان اور مشاہیر پاکستان پر سینکڑوں مضامین بلوچی میں شائع ہوتے رہے۔

بلوچی زبان میں پاکستان اور تحریک پاکستان پر گذشتہ پچاس سالوں میں میری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری۔ قائداعظم کی حیات کے حوالے سے ایک مختصر سا کتابچہ قائداعظم اکیڈمی ،کراچی سے شائع ہوا تھا جسے اکیڈمی کے اس وقت کے چیئرمین جناب شمشیر حیدری نے لکھا تھا اور مجھ سے بلوچی میں ترجمہ کروایا گیا تھا۔ اس کتابچہ کا نام ''سکین'' ہے۔ معلوم نہیں اکیڈمی نے قائداعظم کا نام کیوں قلم زد کردیا۔ قائداعظم کی تقاریر کا براہوئی ،بلوچی میں ایک مجموعہ پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ نے الگ الگ چھاپا، عبدالقادر شاہوانی اس کے مترجم ہیں۔

علامہ اقبال کے بارے میں البتہ ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر اقبال اکیڈمی لاہور نے بلوچی زبان میں ایک دو کتابیں شائع کیں ۔ان میں میر مٹھا خان مری کی کتاب '' درگال '' اور جناب احمد ندیم قاسمی کی کتاب '' علامہ اقبال '' شامل ہیں ۔موخرالذکر کا میں نے بلوچی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔۱۹۰۳ء

اقبالیات کی کتب پر انعامات کے اعلان پر صرف علامہ اقبال کے کلام سے چند منظومات ''دوشکیں کیف'' کے نام سے ترجمہ شائع ہوا۔

تحریک پاکستان میں بلوچستان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، قائداعظم نے اسے پاکستان کا بازوئے شمشیرزن کہا تھا۔ مگر پاکستان کے بارے میں بلوچستان کے علمی ادبی حلقوں کو یکسر نظرانداز کرنے کی وجہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ''تحریک پاکستان بلوچستان'' میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی تالیف کا میر مٹھا خان مری نے بلوچی میں ترجمہ کیا اس کتاب کو جس اعتنائی سے چھاپا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی کاموں میں ہمارا رویہ کس قدر سنگدلانہ اور بے رحمانہ ہے۔ بہرحال امید کی جاتی ہے کہ پاکستان کے بارے میں بلوچی زبان کے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی مستقبل میں نہیں رہے گی۔ اس لیے کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے ادب میں اب امتیازی نقطہ نظر کو مسترد کر دیا ہے۔

رسائل جرائد

میر امان اللہ گچکی کے بعد کریم دشتی مرحوم، جناب عبدالحکیم بلوچ، میر صورت خان مری اور میر عبدالقادر اثیر شاہوانی ''اولس'' کے ایڈیٹر مقرر ہو کر آئے۔ ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق اس سرکاری علمی جریدے کی روایت قائم رکھی اور اس کے اوراق کے ذریعے بلوچی ادب کی ترقی کا سفر جاری رہا لیکن افسوس کہ کئی سالوں سے اب یہ رسالہ موت و حیات کی کشمکش میں رہ کر بالآخر بند ہو گیا ہے۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ اور ''اولس'' بلوچی ادب کی ترقی کے کام میں مصروف تھے کہ ۱۹۶۱ء میں ہی بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کا قیام عمل میں آ گیا۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کو محکمہ تعلیم کی سرپرستی حاصل ہوئی پچیس ہزار روپے سالانہ اس کی گرانٹ جاری کی گئی۔ علمی اور ادبی حلقوں میں اس اعتبار سے اسے خوش آئند قرار دیا گیا کہ بہر حال وہ جو سرکاری عدم توجہی کا بت کھڑا کیا گیا تھا اور بلوچی لکھنا پڑھنا شجر ممنوعہ بنا ہوا تھا وہ بت ٹوٹ گیا۔ مقامی طور پر جتنے بھی ادیب، شاعر اور اہل قلم تھے وہ بلوچی اکیڈمی کے دست و بازو بنے۔ سال میں دو تین کتابوں کی اشاعت کا سامان ہو گیا تھا۔ اکیڈمی کی صدارت پر پیر محمد سردار خان فائز ہوئے جو کئی سالوں تک ادبی امور میں مستعد رہے۔ دوسرے عہدیداروں نے بھی معاوضے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خلوص دل سے کام کیا اور یہ ادارہ پھلتا پھولتا رہا۔ آج بھی اگرچہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے وسائل ضرورت سے بہت ہی کم ہیں مگر لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعاون اسے حاصل ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے طے کر رکھا ہے کہ بلوچی زبان میں عوامی اور کلاسیکی علمی ادبی اثاثہ جب تک اطمینان بخش طور پر جمع کر کے محفوظ نہ کر لیا جائے وہ جدید ادبی تخلیقات کی اشاعت کی جانب قدم نہیں بڑھائے گی۔ اس لیے کہ قدیم اثاثہ اپنے سینوں میں دبائے ہوئے سن رسیدہ لوگ ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں ان سے یہ علمی ادبی اور ثقافتی امانت حاصل کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچانی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکیڈمی کو اپنے اس بلند مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی ہے۔

اگرچہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ایک خاص نپے تلے انداز میں کام کیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر تمام

اداروں سے اس کی کارگردگی بڑھی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۱ء سے اس وقت تک اس کے ممبران کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔ یہ وہ دانشور ہیں جو بلوچی اہل قلم کے عطر کہے جاسکتے ہیں۔ وسائل کی کمی یا فراوانی نے ان پر کبھی بھی اثر نہیں کیا۔ بلوچی اکیڈمی کی کارگردگی کتابوں کے تذکرے کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بلوچی اکیڈمی کراچی اور بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے علاوہ کراچی اور بلوچستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بہت سے ادبی ادارے قائم ہوتے رہے اور قائم ہو رہے ہیں۔ ان اداروں نے اپنے طور پر کام کر کے بلوچی کتابوں کی اشاعت اور ادب میں پیش رفت کے سلسلے میں قابل تعریف کام کیے ہیں۔ ان میں سابقہ پاکستان آرٹس کونسل، جواب ادارہ ثقافت کے نام سے موسوم ہے۔ ملا فاضل اکیڈمی، تربت، عزت اکیڈمی، پنجگور، سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی، آزاد جمالدینی اکیڈمی، کراچی بلوچستان اکیڈمی، تربت، قائداعظم اکیڈمی، کراچی، لبزانکی کاروان تربت، لبزانکی سرچمگ، پنجگور، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، مکتبہ ساربان، مستونگ، بلوچی ادبی بورڈ، کراچی، رابعہ خضداری اکیڈمی، خضدار اور بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن قابل ذکر ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ پاکستان سے باہر بھی بڑی تعداد میں بلوچ آباد ہیں جنہیں اپنی زبان، ادب اور ثقافت سے گہرا لگاؤ ہے۔ انہوں نے بھی خلیجی ریاستوں میں سے ہر ریاست میں ادبی ادارے قائم کیے ہیں جب کہ لندن میں اکبر بارکزئی، روم میں ڈاکٹر بدل خان اور سوئیڈن میں محترمہ کارینا جہانی اور تاج محمد بریسگ بلوچی ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی میں مصروف ہیں۔

پاکستان میں کچھ اور بلوچی زبان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرنے والے ادارے ہیں جو گاہے بگاہے بلوچی لٹریچر کی پیش رفت میں معاونت کرتے ہیں۔ ان میں لوک ورثہ، اسلام آباد، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، اقبال اکیڈمی، لاہور، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد شامل ہیں۔ ۱۹۹۴ء اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۳ء تک شائع کردہ بلوچی کی ذیل میں دی گئی کتابوں کو خطیر رقومات کے انعامات سے نوازا جس سے اہل قلم کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

نام کتاب	مصنف	موضوع	پبلشرز
توار	میر محمد حسین عنقا	شاعری	آزاد جمالدینی اکیڈمی، کراچی
چیہال	مراد ساحر	شاعری	سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی
روچ ءَ کئے کشت کت	اکبر بارکزئی	شاعری	آزاد جمالدینی اکیڈمی، کراچی

ریکانی تل : عظلے	منیر احمد بادینی	ناولٹ	بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ
زری نود	یوسف گچکی	شاعری	بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ
گلیں باندات	عبدالمجید گوادری	شاعری	سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی
ھشکئیں رکھسوز بنت	اللہ بشک بزدار	شاعری	سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی
ہون ہوشام	صبا دشتیاری	افسانہ	عزت اکیڈمی، پنجگور

بلوچی زبان وادب کی ترقی میں انفرادی طور پر بھی بہت سی کوششیں ہوئی ہیں کچھ لکھنے والوں نے اخبارات، جرائد جاری کر کے اس محنت طلب کام میں حصہ لیا ہے اور کچھ نے اپنی گرہ سے کتابیں شائع کی ہیں ۔ یہ فہرست بھی خاصی طول وطویل ہے ۔ جناب عبدالکریم شورش جو ماضی میں ایک بے خوف سیاسی رہنما رہ چکے تھے ۔ انہوں نے ۸ جون ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ ''نوکیں دور'' جاری کر کے بلوچی ادب کے پیش رفت میں نمایاں حصہ لیا ۔ ''نوکیں دور'' سے کچھ عرصہ آزاد جمالدینی اور کامل القادری مرحوم کی وابستگی بھی رہی ۔ جناب عبدالکریم شورش (کریم امن) نے نہایت بے سر سامانی کے عالم میں یہ اخبار جاری رکھا ۔ اس میں بلوچستان کے بڑے بڑے شعراء اور نامور ہستیوں نے مضامین ، نظم ونثر کے ذریعے حصہ لیا ۔ ''نوکیں دور'' نے ۱۹۶۳ء میں ''مکران نمبر'' نکالا جو ایک تاریخی ادبی دستاویز تھا'' کچی نمبر'' اور اہم مواقع پر دوسرے ادبی کاموں نے ''نوکیں دور'' کو معتبر مقام بخشا، جناب عبدالکریم شورش کی یاد میں ''نوکیں دور'' اب بھی جاری ہے ۔

جناب قاضی عبدالرحیم صابر کا نام جدید بلوچی ادب کی تاریخ میں محو نہیں ہو سکتا ۔ انہوں نے کراچی سے اخبار ''صدائے بلوچ'' ۱۹۷۱ء میں جاری کیا اور ساتھ ہی ایک ادبی تنظیم ''بلوچی ادبی بورڈ'' کے نام سے قائم کی ، اس کے بینر تلے کئی کتابیں شائع ہوئیں ۔ ان میں ''دو جہان ءِ سردار'' ''صابر ءِ گفتار'' ''بلوچستان کے جانباز'' بلوچستان کی وادیوں میں'' قابل ذکر ہیں ۔ اسی ادارے نے ۱۹۸۴ء میں میر عیسٰی قومی کا شعری مجموعہ'' گلدستہ قومی'' شائع کیا ۔ جسے ۱۹۸۷ء میں اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا ۔

۱۹۷۰ء میں بلوچستان کے معروف صحافی اور بلوچستان ٹائمز کے مالک مدیر جناب سید فصیح اقبال نے کراچی سے ایک پندرہ روزہ '' زمانہ بلوچی'' جاری کیا جس کے حلقہ ادارت میں مشہور ادیب وشاعر جناب صدیق آزاد ، ظفر علی ظفر شامل تھے ۔ اس پندرہ روزہ نے ادب کے میدان میں لائق تحسین خدمات انجام دیں ۔ بعد ازاں '' پندرہ روزہ زمانہ بلوچی'' کوئٹہ منتقل ہوا ۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۵ء تک حاجی

عبدالقیوم بلوچ کی ادارت میں اس کا ادب اور بھی نکھر آیا۔ اس کے معاونین میں ایوب بلوچ، غوث بخش صابر، الفت نسیم اور دوسرے بہت سے معروف دانشوروں کے نام ہیں۔ یہ اخبار، اب ہفت روزہ کی شکل میں بلوچی ادب کی خدمت میں مشغول ہے۔

حضرت مولانا خیر محمد ندوی جو بلوچی ادب کے پیش رووں میں سے ہیں ''اومان'' کے بند ہونے کے بعد اگست ۱۹۷۸ء سے بلوچی زبان میں ایک اور ماہنامہ ''سوغات'' شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس میں مذہبی علوم کو بلوچی زبان میں منتقل کر کے قارئین تک پہنچانے میں انہوں نے بڑی کاوشیں کی ہیں۔ مکتبہ سوغات سے بلوچی زبان میں دینی کتب کی اشاعت نے اس ادارے کا احترام دوچند کر دیا ہے۔ کراچی سے جناب غلام فاروق بلوچ نے ''لبزانک'' کے نام سے ایک سیریز جاری کیا بعد میں اسے ''بلوچی لبزانک'' کے نام سے باقاعدہ ادبی رسالے کی شکل دی جو اب نہ صرف زبان وادب کی خدمت میں صف اول میں ہے بلکہ اسی ادارے سے ایک اور ''پندرہ روزہ'' کے اجرا کی نوید بھی سنائی دی ہے۔

جناب ایوب بلوچ ایک اعلیٰ پائے کے دانشور ہیں ان کی رہنمائی میں جناب اسلم بلوچ کی ادارت میں ماہنامہ ''چاگرد'' کچھ عرصہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا مگر درمیانی عرصے میں بند ہو گیا تھا اب دوبارہ جناب بابر بلوچ اسے شائع کر رہے ہیں خوشی کی بات یہ کہ یونیورسٹی آف بلوچستان کے تعاون سے قائم کیے گئے تحقیقی شعبہ میں بلوچستان سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کا تعاون بھی ''چاگرد'' کو حاصل ہو چکا ہے۔ ادب و ثقافت کی تحقیق وترقی میں اس جریدے سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

بلوچی زبان کے ایک مایہ ناز دانشور ادیب شاعر جناب عابد آسکانی نے کراچی سے ''بہارگاہ'' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں ایک رسالہ جاری کیا جو دو سال تک باقاعدگی سے چھپنے کے بعد مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔ ایک اور رسالہ ''تپتان'' کے نام سے ۱۹۸۸ء کراچی ہی سے جناب عبدالحیٔ جمشید زئی کی کوششوں سے جاری ہو کر کچھ عرصہ بعد وسائل کی عدم دستیابی کے باعث خاموش ہو کر رہ گیا۔ جناب یار محمد یار جو خود بھی ایک اچھے لکھنے والے ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں انہوں نے ''منزل'' براتر'' لشکر'' اور کئی ایک رسالے جاری کیے ان سب ادبی رسالوں کو جو مشکلات پیش آتی رہی ہیں ان میں سرفہرست مالی عدم توازن ہے۔ بلوچی زبان میں لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ البتہ قارئین جس شوق یا ضرورت سے انگریزی اردو کے اخبارات ورسائل کو خرید کر پڑھتے ہیں۔ بلوچی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس شوق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ بلوچی زبان کا ذریعہ تعلیم نہ ہونا ہے۔ ذریعہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ایک مروج رسم الخط نہیں پایا جاتا۔

مختلف علاقوں کے بلوچی لکھنے والے اپنے اپنے لہجوں میں لکھتے ہیں۔ جس سے دوسرے لہجوں کے لوگ کم ہی آشنا ہوتے ہیں۔اس سے ادب میں مغائرت بڑھتی ہے۔۱۹۷۲ء نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت میں وزیر تعلیم میر گل خان نصیر نے رسم الخط کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے ایک سیمینار منعقد کرایا تھا۔ جس میں بلوچستان کے تمام علاقوں سے اہل قلم نے شرکت کی مگر رسم الخط کے سلسلے میں اتفاق رائے کی صورت سامنے نہیں آسکی۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے اپنی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر ایک اور سیمینار منعقد کیا تھا۔ جس میں غیر ملکی ماہرین نے بھی شرکت کی یہ مسئلہ تب بھی حل نہیں ہوسکا۔ ہر چند کہ بلوچستان یونیورسٹی نے فاضل اور ایم اے کی سطح کے امتحانات کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور بہت سے اس سے مستفیض بھی ہوچکے ہیں۔ مگر یہ اقدام کچھ زیادہ سودمند نظر نہیں آتا۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں جب بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن آج کے مقابلے میں زیادہ فعال، مستعد و متحد تھی اس تنظیم نے نہ صرف طلباء کے حقوق کی پاسداری میں نمایاں خدمات انجام دیں بلکہ اپنی زبان، ادب اور ثقافت سے اظہار وابستگی کے طور پر دو ادبی انتخاب ''بولان نامہ'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کرائے ان دنوں بی ایس او کے بلوچ ادباء اور شعراء سے نہ صرف گہرے روابط تھے بلکہ خود طلباء میں بھی اعلیٰ ادبی ذوق پایا جاتا تھا، بولان نامہ کے یہ انتخاب بلوچی ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ان کتابوں میں بلوچی زبان کے جن معروف دانشوروں کے مضامین نظم ونثر سے استفادہ کیا گیا۔ ان میں میر مٹھا خان مری، میر محمد حسین عنقا، طاہر محمد خان، محمد حسن نظامی، فقیر محمد عنبر، غوث بخش صابر، نیک محمد بزدار، ملک محمد رمضان بلوچ، امان اللہ گچکی، عطا شاد، ملک محمد پناہ، عبدالکریم بلوچ، عبدالغفار ندیم، میر گل بنگلزئی، پیر محمد زبیرانی، راہی براہوئی، عبدالرحمٰن براہوئی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

بلوچی زبان میں ریڈیو پاکستان خضدار اور تربت سے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ خضدار میں اب تک رابعہ خضداری اکیڈمی کی تشکیل کے علاوہ کسی طرح کی ادبی پیش رفت کا پتہ نہیں چلا البتہ ریڈیو پاکستان تربت کے منتظمین کی مساعی اور وہاں کے اہل قلم کی کوششوں سے کیچ مکران کے عظیم ثقافتی ورثے اور تابناک تاریخ کے حوالے سے ۴ جنوری ۱۹۹۴ء کو ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر رولینڈ اور اطالوی ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ولیریا نے شرکت کی جبکہ پاکستان کی صف اول کے ادیبوں نے کیچ کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مولانا عبدالحق بلوچ، بشیر احمد بلوچ، عبدالغفار ندیم، ڈاکٹر منیر احمد بلوچ، عطا شاد، پروفیسر عبدالغنی پرواز اور افضل پرویز کے مقالات کے جستہ جستہ اقتباسات اسی کتاب میں اپنے مقام پر درج کیے جارہے ہیں۔

ماہنامہ ''اومان'' کا اجرا

لیاری کراچی میں ایک تعلیمی انجمن، بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی قدیم عرصہ سے قائم ہے۔
حضرت مولانا خیر محمد ندوی اس کے مدار المہام ہیں اگرچہ یہ تعلیمی ادارہ اب قومی ملکیت میں دیا جاچکا ہے لیکن مولانا ندوی کی علمی بصیرت، وطن سے وابستگی، اسلام سے غائت درجہ محبت نے انہیں ایک مؤقر مقام دے رکھا ہے۔

بلوچی زبان میں ریڈیو پاکستان کراچی سے جب نشریات کا آغاز ہوا تو نگاہ انتخاب انھیں پر پڑی چنانچہ ایک اور بے مثل دانشور سیّد ظہور شاہ ہاشمی کی رفاقت میں انہوں نے اس کام کی نگرانی کا ذمہ اٹھایا۔ اسی کے ساتھ ہی مولانا خیر محمد ندوی نے زبان کی ترقی کے خواہاں احباب کی مدد سے ''اومان'' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اومان بلوچی زبان کا پہلا ماہنامہ ہے۔ اس رسالے کو اگرچہ مختصر زندگی ملی مگر یہ بلوچی زبان وادب کی خدمات میں ہراول دستہ کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ماہنامہ ''بلوچی'' کا اجرا

یہ ماہنامہ ۱۹۵۶ء میں جناب آزاد جمالدینی کی ادارت اور میر عبداللہ جمالدینی کی مشاورت ونگرانی میں کراچی سے جاری ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس اہم رسالے کے اجرا سے پہلے اصناف نثر کی جانب لکھنے والوں کی کچھ بھی توجہ نہ تھی تو غلط نہ ہوگا۔ آزاد جمالدینی نے ''بلوچی'' کے ذریعے لکھنے والوں کو نہ صرف ترغیب دی بلکہ مقدور بھر رہنمائی بھی بخشی۔ نظم تو بلوچی میں بہت پہلے سے عوامی گیتوں اور کلاسیکی شاعری کے ذریعے موجود تھی مگر تحقیق، تسوید، انشاپردازی، ڈرامہ اور افسانے کی اصناف کا ''بلوچی'' نے ذوق ابھارا۔ آزاد جمالدینی کو سینکڑوں خطوط، مضامین وغیرہ ہر ماہ ملا کرتے تھے۔ وہ ان مضامین کو یکساں طرز تحریر میں دوبارہ لکھ کر اپنے رسالے میں شائع کرتے تھے۔ ماہنامہ ''بلوچی'' کراچی کے لکھنے والوں میں کراچی، ڈیرہ جات سندھ اور بلوچستان کے اہل قلم بلا تخصیص شامل تھے۔ خصوصیت سے عبدالصمد امیری، عبداللہ جان جمالدینی، احمد زہیر، مراد ساحر، کریم دشتی، میر شیر محمد مری، میر عیسیٰ قومی، اکبر بارکزئی، امان اللہ گچکی، آدم حقانی، انور شاہ قحطانی، عبدالرحمٰن کرد، احمد جگر، حاجی عبدالقیوم بلوچ اور بہت

سے نوآموز لکھنے والوں کو اس تاریخ ساز رسالے نے لکھنے کے فن سے آشنا کیا۔"بلوچی" کے دستیاب شماروں میں میر گل خان نصیر، سیّد ہاشمی اور میر محمد حسین عنقا کی تحریریں بھی ملتی ہیں۔

کراچی میں بلوچی ادب کی ترویج واشاعت میں اور بھی کئی اداروں نے حصہ لیا۔ ان میں بلوچی اکیڈمی کے علاوہ بلوچی ادبی بورڈ جس کے مہتمم قاضی عبدالرحیم صابر تھے۔ جو خود بھی اچھے شاعر اور معروف ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے متعدد اردو، بلوچی کتابیں لکھیں اور اس ادارے کی نگرانی میں انہوں نے ایک ہفت روزہ "صدائے بلوچ" شروع کیا جو ان کی حیات تک جاری رہا۔ ایک اور مرحوم آزاد جمالدینی سے موسوم "آزاد جمالدینی اکیڈمی" ہے۔ جس نے چار پانچ کتابیں شائع کی ہیں۔

ماہنامہ بلوچی کے کراچی سے بند ہونے کے بعد بلوچی ادب کی مرکزیت بلوچستان کے سب سے بڑے شہر کوئٹہ میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کی وجہ سے پہنچی۔ مگر اب بھی کراچی میں سیّد ہاشمی اکیڈمی، بہارگاہ پبلی کیشنز، بلوچی پبلی کیشنز، بلوچ کلچرز لٹریری سوسائٹی وغیرہ مصروف کار ہیں۔

ریڈیو پاکستان، کوئٹہ

بلوچی ادب خصوصاً شاعری کی ترقی و تشویق میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا قابل قدر حصہ ہے۔

۱۹۵۶ء اکتوبر میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے مکران ہاؤس سے ہی جہاں یہ عارضی طور پر قائم تھا بلوچی زبان میں مقبول پروگرام پیش کیے گو، دورانیہ زیادہ نہیں تھا مگر شعبہ بلوچی کے کارکنوں نے اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ تقاریر، ڈرامے اور صنف شاعری سے متعلق بلوچی کے ابتدائی زمانے کے پروگرام بھی معیاری ہوا کرتے تھے۔ بعد میں جب ریڈیو پاکستان کوئٹہ کی اپنی عمارت ۱۹۶۴ء میں تیار ہوئی اور نشر گاہ کی قوت ایک سے بڑھ کر دس کلو واٹ میڈیم اور دس کلو واٹ شارٹ ویو ہوئی تو ریڈیو نے ادبی خدمات کو مزید وسعت دی۔

ابھی بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ گئی، دوسری زبانوں کی طرح بلوچی ادیب، شاعر اور فنکاروں نے اپنی محب الوطنی کا اس مرحلے پر بھرپور اظہار کیا۔ ولولہ انگیز ڈرامے، فیچر اور ملی نغمات کی تخلیق نے اہل قلم کی صلاحیتوں کو ابھارا، بلوچی ادب میں نکھار سا آ گیا۔ رزم چونکہ بلوچی شاعری کا خاص موضوع رہا تھا اس لیے شعراء نے ماضی کو حال سے پیوست کرتے ہوئے یادگار ترانے لکھے۔

بلوچی کے ممتاز ادیب جناب بشیر احمد بلوچ نے خود بھی اس قلمی جہاد میں حصہ لیا اور نگرانی اور انتخاب میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ممتاز شاعر عطا شاد اور میر صورت خان مری جو پروگرام پروڈیوسر تھے انہوں نے بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا فقید المثال اظہار کیا۔ دوسرے باکمال اور محنتی فنکاروں اور شعراء کے صف میں راقم السطور بھی دانشوروں میں شامل تھا۔

بلوچستان میں ابھی ٹیلی ویژن کی نشریات کا تصور بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ ریڈیو تفریح کا عام ذریعہ اور اہل قلم کے لیے میدان شہسواری بنا ہوا تھا۔ جام درک، مست توکلی، ملا فاضل اور دوسرے کلاسیکی شعراء کے کلام کے علاوہ جدید شعراء کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا۔ میر گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، میر محمد

حسین عنقا، اکبر بارکزئی کا کلام ریڈیو سے نشر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ عطا شاد، قاضی عبدالرحیم صابر، جواں سال بگٹی، نصرت اللہ شیدا، غوث بخش صابر، کریم دشتی، ابراہیم عابد، میر عیسیٰ قومی، سید ظہور شاہ، جی آر ملا، مراد ساحر وغیرہ نے اس دور میں نہ صرف غزل، نظم، ڈرامہ، فیچر وغیرہ میں اپنے جوہر دکھائے بلکہ اس حوالے سے تراجم اور تنقید کی راہیں بھی ہموار کیں۔ جناب کریم دشتی نے دو مختصر کتابیں (جو دراصل ریڈیائی تقاریر کا انتخاب تھیں) ''لبز انگ'' اور ''شرگداری'' کے نام سے شائع کیں جو تنقید کے سلسلے میں پہلی کوشش تھی۔ اول الذکر کتاب اب نایاب ہے۔

اس زمانے میں ''بزم ثقافت'' کے نام سے ایک ادارہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے اس دور کے ریجنل ڈائریکٹر جناب کے۔ جی۔ علی نے جسٹس میر خدا بخش مری، خان عبدالصمد خان درانی، میر مٹھا خان مری، ملک رمضان، میر عبدالرحمٰن کرد اور نور محمد پروانہ کے تعاون سے بنایا۔

اس ادارے نے ''قدیم بلوچی شاعری''، مرتب: میر خدا بخش مری اور ''ثقافت وادی بولان میں'' چھپوا کر ادب کے میدان میں ایک اچھی ابتدا کی۔ ''قدیم بلوچی شاعری'' ایک انگریز پولیٹیکل (Political) افسر مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کی کتاب The Papuler Poetry of Balochis کا جزوی ترجمہ ہے۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے جدید بلوچی ادب کی ترقی میں اگرچہ قابل قدر کردار ادا کیا لیکن اس کی اہمیت تاریخ ساز نہ ہوتی اگر ''الس'' کے اوراق اسے خود میں نہ سمیٹ لیتے۔ بلوچی زبان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ٹرائبل آرگنائزیشن نے ۱۹۶۱ء کے اواخر میں بلوچی اور پشتو زبان میں کوئٹہ سے دو رسالے جاری کیے گو ان رسالوں کا بنیادی مقصد عوام کو حکومت کی ترقیاتی کارکردگیوں سے باخبر رکھنا تھا مگر ''الس'' بلوچی کے باذوق مدیر جناب امان اللہ گچکی نے اس میں بلوچی جدید ادب کو محفوظ کرنے اور اس کی وساطت سے سرکاری پالیسی کے مطابق ترقیاتی امور کی جانب عوام کو خوبصورتی سے متوجہ کیا۔ اب جو کچھ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے نشر ہوتا اس کا بیشتر حصہ ''الس'' میں بھی چھپ جایا کرتا۔ لکھنے والوں کو یہ خدشہ نہ رہا کہ ریڈیائی لہروں پر ان کی نگارشات روشن ہوا سے اتر کر معدوم ہو جائیں گی۔ وہ نہایت محنت سے تقاریر، ڈرامے، فیچر، نظم اور غزل لکھنے لگے اور ''الس'' ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ انہیں اپنے قارئین تک پہنچاتا رہا۔

میر امان اللہ گچکی جو خود بھی ایک معروف اور سلجھے ہوئے اہل قلم ہیں انہوں نے بلوچی لکھنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد پیدا کی اور بلوچی کے اکابر اہل قلم سے کامیاب رابطے قائم کیے۔ اس طرح ریڈیو اور

''الس'' کے باہمی تعاون سے تمام متداول اصناف میں طبع آزمائیاں ہوتی رہیں۔

اس دور کے ممتاز بلوچی اہل قلم میں میر محمد سردار خان بلوچ، میر بشیر احمد بلوچ، عطا شاد، حاجی عبدالقیوم بلوچ، میر صورت خان مری، میر گلزار خان مری، عبدالمالک بلوچ، آزاد جمالدینی، میر عبداللہ جان جمالدینی، کریم دشتی، عبدالحکیم بلوچ، سیّد ظہور شاہ ہاشمی، پیر محمد زبیرانی، صدیق آزاد، محمد طاہر مرزا، عبدالغفار ندیم، میر مٹھا خان مری، غوث بخش صابر، ملک محمد رمضان بلوچ، عبدالرحمٰن غور، میر محمد بخش لہڑی، اور درجنوں نوآموز ادیبوں نے استفادہ کیا۔

بلوچی اکیڈمی، کراچی

بلوچی اکیڈمی کراچی نے بلوچی ادب کے معاملے میں پیش قدمی کی تھی، جس نے جدید بلوچ شعراء کے کلام کا ایک انتخاب ''مستاگ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس میں اکیس کے قریب شعراء شامل تھے۔ اسے مشہور آزادی پسند اور ترقی پسند صحافی میر غلام محمد شاہوانی کے نام سے منسوب کیا گیا جن کا ستمبر ۱۹۵۸ء میں جوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ شعراء میں میر گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، اسحاق شمیم، عطا شاد، قاضی عبدالرحیم صابر، عبدالحکیم حقگو، ملک محمد طوقی، احمد زہیر، آدم حقانی، محمد حسین عنقا، ملک محمد سعید، انور شاہ قحطانی، شوکت حسرت، اکبر بلوچ (اکبر بارکزئی) احمد جگر، ناگمان جمعہ کلاچی، دوست محمد بیکس اور رونق بلوچ کا کلام منتخب کیا گیا تھا۔
بلوچی اکیڈمی کراچی نے جو دوسری کتاب ''شپ گروک'' کے نام سے میر گل خان نصیر کا مجموعہ کلام شائع کیا۔ اسے اس وقت کی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ ''گلبانگ'' جو میر گل خان نصیر کی پہلی کتاب تھی اس میں بلوچی کے اس محب وطن اور ترقی پسند شاعر کو نوآموز خیال کیا گیا تھا۔ مگر ''شپ گروک'' میں ان کا تاریخی اور سماجی شعور اپنے شباب پر ہے۔ جناب اکبر بارکزئی نے ''شپ گروک'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔

''نصیر کی شاعری ایک ایشیائی بلوچ کی بے قرار روح کے غموں، دکھوں اور آرزوؤں کا بے کم و کاست بیان ہے۔ نصیر کی زندگی نے بہت سے مصائب جھیلے، قید و بند کی صعوبتیں، جلاوطنی کی تکلیفیں برداشت کیں، مگر وہ زندگی سے فرار نہیں ہوئے شکست کا نام نہیں جانتے۔''

میر گل خان نصیر کے مجموعہ کلام ''شپ گروک'' کی بیشتر نظمیں مقبولیت کے معیار پر پوری اترتی ہیں مگر ۔۔۔ ''ڈیوا (دیا)'' اور ''بیا او مرید'' عوام میں بے حد پسند کی گئیں۔ جو زبان زد عام و خاص ہیں۔

کراچی میں بلوچی ادب کے سلسلے میں جو بہت بڑی پیش رفت ہوئی وہ آزاد جمالدینی کی ادارت میں جون ۱۹۵۶ء میں ماہنامہ ''بلوچی'' کا اجرا تھا۔ ہر چند کہ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ رسالہ بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکا مگر ادب پر اس کے اثرات نے کئی عشروں تک بلوچی لکھنے پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔

آزاد جمالدینی خود بہت بڑے قوم پرست تھے زبان سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔ اہل قلم میں ان کا اور ان کے بھائی میر عبداللہ جان جمالدینی کا حلقہ وسیع تھا، یہ دونوں بھائی بلوچی زبان کے بلا مبالغہ محسنین میں شمار ہوتے ہیں، ماہنامہ ''بلوچی'' کراچی سے ۱۹۶۰ء میں بند ہوا، آزاد جمالدینی مایوس ہو کر نہیں بیٹھ رہے بلکہ وہ ایرانی بلوچستان گئے۔ کئی سال وہاں گزارے جو کچھ پایا اسے زبان کی ترقی وترویج کے لیے سینت سینت کر رکھا اور ۱۹۷۷ء میں ان کی ادارت میں ''بلوچی'' کا احیاء ہوا۔ جو ان کی وفات تک جاری رہا ، مرحوم کی اس نشانی کو تیسری مرتبہ ستمبر ۱۹۸۶ء میں زندہ کیا گیا۔ آزاد کا بویا ہوا بیج اب ماہنامہ ''بلوچی'' کوئٹہ کی صورت میں ایک لہلہاتے پودے کی شکل میں عبدالواحد بندیگ کی ادارت ونگرانی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مستقبل میں امید ہے کہ بلوچ عوام کا یہ قومی ترجمان بلوچی ادب کا تناور درخت بن کر سایہ فگن ہوگا۔

۱۹۵۶ء میں بلوچی پروگرام ریڈیو پاکستان کراچی سے کوئٹہ منتقل ہوا۔ اس کے نتیجے میں عارضی طور پر کراچی میں بلوچی ادب کی ترقی متاثر ہوئی۔ ماہنامہ ''بلوچی'' کے بند ہونے میں اس تبدیلی کا بھی ہاتھ تھا کہ کئی ایک معاونین کو کوئٹہ منتقل ہونا پڑ گیا تھا تاہم کراچی میں چھوٹے چھوٹے ادبی ادارے مصروف کار رہے اور وقتاً فوقتاً ان کی کارکردگی ایک آدھ کتاب کی اشاعت کی شکل میں سامنے آتی رہی۔ ان اداروں کے بارے میں دستیاب معلومات مناسب موقع پر مع ان کی خدمات کے سپرد قلم کی جائیں گی۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ شروع میں ایک نجی عمارت مکران ہاؤس میں قائم کیا گیا۔ پانچ چھ سالوں تک ایک کلوواٹ کی طاقت کی یہ نشرگاہ اس قدر اہم نہ سہی مگر بلوچی زبان کی تقویت کا باعث بہر حال رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں دس دس کلوواٹ میڈیم ، شارٹ ویو کے ٹرانسمیٹر کی تنصیب سے ایک طرف اس کی کارکردگی میں وسعت پیدا ہوئی تو دوسری طرف بلوچی زبان کی پیش رفت کے لیے ایک مستقل معاون ادارہ بنا۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کی وجہ سے بلوچی ادب میں جو ترقی ہوئی اس کا الگ سے بیان ہوگا۔

بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ

بلوچی ادب کی ترویج وپیش رفت میں ان گنت ادبی،ثقافتی،طباعتی،اداروں اور تنظیموں نے حصہ لیا، قیام پاکستان کے بعد یہ ادارے کراچی،کوئٹہ،تربت،پنجگور،منداور بیرون پاکستان قائم کیے گئے ان میں سے کچھ معدوم ہوئے کچھ موجود ہیں۔تاہم ایسے اداروں کی کوششوں کی پشت تجارتی مقاصد و مفاد کے بجائے زبان سے محبت،ادب سے وابستگی،ثقافت کی روشناسی اور بلوچ قوم کے حقوق،مفادات اور علم وفن کا فروغ رہا ہے۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کو معاصر اداروں کے مقابلے میں اس اعتبار سے فخر حاصل ہے کہ وسائل کی کمیابی عدم سر پرستی کے باوجود قدیم وجدید ادب،تاریخ،ثقافت اور تمدنی امور پر سو سے زائد کتابیں حاصل۔راقم السطور اس ادارے کی یوم تاسیس سے ذہنی،جذباتی وابستگی رکھتا آیا ہے۔ حکومتوں نے اس کے مقاصد اور مسائل سے جس طرح اغماض برتا وہ ایک طویل کہانی ہے۔مگر اس کو بنانے اور قائم رکھنے والوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی بساط کے مطابق کام جاری رکھا،اس میں آج بھی منفعت سے بالاتر رضا کارانہ طور پر اہل علم،دانشور مصروف کار ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی،ابتدا میں اس کے اراکین کی تعداد محدود تھی اس وقت پچاس سے زیادہ ادباء اور شعراء اس کے رکن ہیں۔ادارے کو جمہوری خطوط پر چلایا جا رہا ہے۔میر محمد سردار خان بلوچ،میر خدا بخش مری،میر شیر احمد بلوچ،حاجی عبدالقیوم،میر امان اللہ گچکی،عطا شاد،میر مٹھا خان مری،مرزا محمد طاہر،عبدالحکیم بلوچ،ملک محمد پناہ،میر صورت خان مری اس کے ابتدائی ممبران میں سے ہیں۔ بعد میں ملک محمد رمضان،ایوب بلوچ،عزیز محمد بگٹی،میر عاقل خان مینگل،میر عبداللہ جان جمالدینی،میر گلزار خان مری،غوث بخش صابر،میر محمد خان مری،ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی،میر خان محمد دشتی،اور بہت سے دانشوروں کا بھی اس ادارے کو تعاون حاصل رہا ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے دستور العمل میں ایک خاص شق شروع ہی سے شامل ہے۔جس کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔کہ بلوچستان میں قدیم شعراء ادب،لوک کہانیاں،عوامی گیت،ثقافت وتمدن کے حوالے سے

رسومات، مشاہیر اکابرین ادب کے بارے میں ہر طرح کے مواد کو ترجیح حاصل رہے گی۔ جب تک سینہ بہ سینہ محفوظ ورثہ جدید عصری تقاضوں کے مطابق منتقل نہ ہو جائے جدید ادبی تحریروں کی اکیڈمی کے پلیٹ فارم پر طباعت بندش ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ اس پابندی کی وجہ سے قدیم شعراء وادب کی تلاش وتحقیق میں بڑی مدد ملی ہے۔ بلوچی اکیڈمی نے اب تک جس قدر بھی مواد شائع کرایا ہے اس کا بیشتر حصہ لوک ادب وشاعری، کلاسیکی شاعری، تاریخ، رومانی داستانوں پر مشتمل ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ایک اور مناسب قدم اٹھایا ہے کہ تحقیق، تدوین کے لیے زبان کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ اس کے نتیجے میں بلوچی زبان، ادب، ثقافت کے سلسلے میں انگریزی، اردو، فارسی میں بھی لاتعداد کتابیں شائع ہو کر سامنے آئی ہیں، بلوچی زبان میں ظاہر ہے کہ یہ کام کافی تاخیر طلب تھا۔

اصناف نثر میں اکیڈمی نے مذہب، تاریخ، لوک کہانیاں، داستان اور تذکروں کے ذریعے قابل قدر اثاثہ کے تحفظ کے لیے کام کیا ہے جبکہ لوک گیت، کلاسیکی شاعری اور منظوم داستانیں شاعری کے شعبے میں حاصل کر کے چھاپی ہیں اور تذکروں کے علاوہ تدریسی مواد پر مشتمل کتب شائع کر کے دوسری علمی ادبی تنظیموں پر اپنی فوقیت ثابت کی ہے۔ اب تک محدود وسائل کے باوجود رضا کارانہ جذبہ اور جمہوری روایات کا اتباع کرتے ہوئے چونتیس (۳۴) سالوں میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ایک سو سے زائد انگریزی، اردو، فارسی اور بلوچی کتابیں شائع کی ہیں۔ موضوعات کے مطابق ان کتابوں کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مذہبی کتب

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اپنے قیام سے اس وقت تک مسلسل اس کوشش میں رہی ہے کہ کلام مجید کا ایسا بلوچی ترجمہ حاصل کر کے شائع کرے جو ہر طرح سے متفق الیہ ہو یہ بلاشبہ باعث ثواب، خیر و برکت ہوگا کہ اکیڈمی جلد اس فرض سے سبکدوش ہو۔ مذہبی کتب میں حاجی محمود مومن بزدار کی کتاب ''دو جہان ء سردار'' رسالت مابﷺ کی حیات طیبہ پر محیط ہے جبکہ ماہر تعلیم پروفیسر ابوالقاسم عینی نے احادیث مبارکہ کا ترجمہ ''اربعین عینی'' کے نام سے شائع کرایا ہے۔

تذکرے

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی مطبوعات میں سب سے زیادہ تعداد تذکروں اور قدیم بلوچی شاعری کی ہے۔ یہ دونوں موضوعات ایک دوسرے سے کچھ زیادہ فصل نہیں رکھتے۔

مست توکلی جو بلوچی کے صوفی شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں ان کی حیات، شاعری، اور داستان عشق پر تین کتابیں سرمست بلوچستان، توکلی مست، سمو بیلی مست شائع کی ہیں، ان میں سے دو اردو زبان میں، ایک بلوچی میں، اولذکر میر محمد سردار خان بلوچ، موخرالذکر میر مٹھا خان مری کی تالیفات ہیں۔

تذکروں میں سب سے پہلی کتاب جام درک کے کلام پر مشتمل ہے۔ جسے میر بشیر احمد بلوچ نے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے مرتب کیا ہے۔

میر بشیر احمد بلوچ نے مکران کے عظیم شاعر ملا فاضل رند کا کلام ''شپ چراگ'' کے نام سے اور مکران کی ایک قدیم عشقیہ داستان ''للہ وگراناز'' کے نام سے مرتب کر کے پیش کی ہیں۔

حاجی محمود مومن بزدار جو ڈیرہ غازی خان کے ایک دورافتادہ قصبے سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے ڈیرہ غازی خان کے ایک قدیم شاعر علی محمد چگھا بزدار کی حیات اور شاعری پر کتاب لکھی ہے۔

جناب یوسف گچکی نے حسن زرگر گچکی کی حیات اور شاعری کو ''گوناپ'' کے نام سے اور جھالاوان کے معروف شاعر ملک دینار میرواڑی کے عہد اور افکار کو ''زری نوذ'' کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ ''زری نوذ'' کتاب اکادمی ادبیات پاکستان سے انعام کی مستحق قرار پا چکی ہے۔

میر پیر محمد زبیرانی نے بلوچستان کے صوفی شاعر فیصل فقیر کے نام سے ''گلشن اشعار'' اور مرحوم عبدالرحمٰن غور نے ''نغمہ کہسار'' میں بلوچستان کے کئی ایک قدیم شعراء کا ذکر کیا ہے۔

میر گل خان نصیر جو بلوچی زبان کے نہ صرف مقبول شعراء کی صف اول میں تھے بلکہ اعلیٰ ترین اوصاف سے متوصف ایک سکالر بھی تھے انہوں نے بلوچی شاعری کو مختلف زاویوں سے پرکھ کر اسے مختلف عنوانات کے تحت الگ الگ جلدوں میں سمیٹا، ''بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی'' اس سلسلے کی پہلی کاوش تھی۔ بعد میں انہوں نے بلوچی شاعری کو رزم و بزم میں تقسیم کیا، بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی عشقیہ

شاعری، تقریباً کلاسیکی شاعری کے تمام رنگ ملتے ہیں۔

بلوچی قدیم شاعری میں چند ایک تاریخی نظموں کو میر شیر محمد مری نے ''کہنیں شاعری'' کے نام سے ان نظموں کے پس منظر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں بہت سے تاریخی واقعات سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ میر شیر محمد مری بلوچی زبان کے محققین میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ''بلوچی زبان وادب، تاریخ'' میں بلوچی زبان کی قدامت، مختلف ادوار میں اس پر مرتب ہونے والے اثرات پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ آغا میر نصیر خان اور پیر محمد زبیرانی نے اسے اسی نام سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

میر مٹھا خان مری نے اپنے علاقے اور زاد بوم کے حوالے سے کوہ سلیمان کے مری شعراء کو متعارف کرانے میں ایک عمر تحقیق کے میدان میں گزاری، مست توکلی، رحیم علی مری، بجار، عومر اور کئی ایک نامور اور گمنام ہستیوں کو بلوچی ادب سے روشناس کرایا۔ ''رحم علی مری'' جو ۱۸۳۸ء میں مری اور انگریز کی جدال وقتال کے چشم دید گواہ تھے۔ ان کی ایک طویل نظم حاصل کر کے شائع کرائی اس نظم کو بعد میں ''جنگ گہند'' کے نام سے راقم السطور نے منظوم اردو ترجمہ کر کے شوباز پبلی کیشنز، کے اہتمام سے شائع کرایا۔

ڈاکٹر محمد حیات مری نے بھی علاقہ مری کے سرفروشوں، مجاہدوں اور ہیروز کو اپنی کتاب'' گاریں گوہر'' میں متعارف کرایا ہے جس کی ادبی اور تاریخی اہمیت ہے۔

جناب عبدالرزاق نادر نے میر عبدالکریم میرواڑی کو جو مشکے جھالاوان کے دوسرے بڑے شاعر تھے۔ ''شاشان'' کے صفحات پر حیات نو بخشی ہے۔ ایسی ہی ایک معلومات افزا کتاب'' مرگ وعینا'' کے نام سے میر عبداللہ جان جمالدینی نے مرتب کی ہے۔ جس میں چاغی کے عوامی شاعر شیر جان کی حیات اور شاعری موضوع گفتگو ہے۔ اکرم صاحب خان، محمد بیگ بیگل کے بعد بلوچی کے ایک اور مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے ''یات سوغات'' میں مختلف عشقیہ داستانوں کو جمع کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی ہے۔

پاکستانی بلوچستان کی طرح ایرانی بلوچستان میں بلوچی زبان کے نامور شعراء اور اہل قلم بلوچی زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں جناب اشرف سربازی، عبدالحیٔ جمشیر زئی، غلام نبی شیرازی وغیرہ زبان وادب کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔ جناب اشرف سربازی نے تو متعدد مرتبہ پاکستان میں آکر بھی بلوچی زبان کے ادبی حلقوں کو تعاون سے نوزا ہے۔ مولانا عبداللہ پیشینی جو وہاں کے معروف شعراء میں سے تھے اشرف سربازی نے ''مکران ءِ شیئر'' میں ان کا کلام شائع کرایا ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے لوک ادب اور کلاسیکی ادب کو محفوظ کرنے کی کوشش و ہر کاوش کا خیر مقدم کیا ہے۔ لوک ادب کہانیوں، لوک گیتوں، ضرب الامثال اور پہیلیوں پر کئی کتابیں شائع کی ہیں لوک

کہانیوں پر مشتمل نو جلدیں اب تک شائع کی گئیں ہیں۔ان کے مرتبین، ملک محمد پناہ، میر محمود خان مری، میر گلزار خان مری، حاجی محمود مومن بزدار، اسحاق بزدار، میر عاقل خان مینگل اور امان اللہ غازی نے مختلف لوگوں سے سن کر سپرد قلم کیا۔ دستان یا دستانغ، لوک گیتوں کی ایک صنف ہے اسے نے کی مدد سے گاتے بجاتے ہیں۔ دستانوں میں اگر ذرا بھی تحقیق کی جائے تو ادبی شہ پارے دیکھنے کو ملتے ہیں، ضرب الامثال اور محاوروں پر مشتمل، بتل و گالوار، گوشتن، غوث بخش صابر نے ایسے کئی دستانغ اور لوک گیت جمع کیے ہیں، ضرب الامثال اور محاورں پر مشتمل ''بتل و گالوار'' گوشتن، غوث بخش صابر اور میر گلزار خان کی کاوش کا حاصل ہیں جبکہ پہیلیوں پر مشتمل کتاب ''چاچ و بند'' غوث بخش صابر نے مرتب کی ہے۔

جناب عطا شاد نے ''درین'' کے نام سے مختلف قسم کے لوک گیتوں کا جناب عین السلام سے مل کر منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ بلوچی کلاسیکی شاعری کے مختلف زبانوں میں بکھرے جواہر پارے جنہیں الگ سے کتابی شکل دینا اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہر ایک نظم یا نظمیں الگ الگ شعراء کی ہیں انہیں ''رچنکیں لال'' کے نام سے مطبوعات کے ایک سلسلے میں سمیٹا گیا ہے۔اس سلسلے کی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کے مرتبین غوث بخش صابر، یوسف گچکی، پیر محمد زبیرانی، مومن بزدار، اسحاق بزدار ہیں۔

زبان و ادب کی تاریخ کے علاوہ تاریخی موضوعات پر میر محمد سردار خان بلوچ نے انگریزی اور بلوچی زبانوں میں گرانقدر اثاثہ زبان کی نذر کیا ہے۔ عظیم بلوچ شخصیت سردار چاکر خان رند کی حیات اوران سے منسوب واقعات پر کتاب The Great Baloch قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔اس کا اردو ترجمہ جناب عبدالغفار ندیم نے ''چاکر اعظم'' کے نام سے کیا ہے۔

انگریزوں کی اس خطے میں آمد کی بلوچ قوم نے قدم قدم پر مزاحمت کی اور آزادی کے لیے بلوچ مشاہیر سر بکفن ہو کر میدان میں آئے ان کی شجاعت اور وطن سے محبت کی کہانیاں بلوچستان کے ہر طرف ہر قریے میں بکھری ہوئی ہیں ان قابل احترام ہستیوں کا ذکر ''پلنگ و بلوچ'' نام کی کتاب میں میر محمد سردار خان نے یک جا کیا ہے۔ میر صاحب موصوف نے ''ضخیم جلدوں میں A Litrerary History of Balochis میں کلاسیکی دور کے شعراء، ادباء اور دانشوروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تاریخ کے موضوع پر بلوچی اکیڈمی نے بلوچی میں کم مگر اردو میں بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔سب سے اہم کتاب ''تاریخ بلوچستان'' جسے انگریزی عہد میں انگریزوں ہی کے ایک ہندو افسر رائے بہادر ہتو رام نے لکھا تھا اسے ملک پناہ مرحوم نے زبان کی درستگی کی حد تک نظر ثانی کر کے شائع کرایا۔اس ایڈیشن کی مدد سے بعد میں دوسرے اداروں سے بھی یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔لیکن کریڈٹ بہر حال بلوچی

اکیڈمی کو جاتا ہے۔ آغا میر نصیر خان احمد زئی نے ریاست قلات کے ریکارڈ کی چھان پھٹک سے'' تاریخ بلوچ و بلوچستان'' پانچ ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے۔ مشہور مورخ جناب مولائی شیدائی کی لکھی ہوئی'' تاریخ قلات'' اور جناب عبدالقادر اشیر شاہوانی کی مرتب کی ہوئی کتاب'' آئینہ خاران''، قلات اور خاران کی شناخت پر معلومات افزا کتب میں سے ہیں۔ اسی سلسلے میں سابق ریاست قلات کے ایک اعلیٰ عہدیدار آخوند صالح محمد کا ایک قلمی مخطوطہ'' کورد گال نامک'' فارسی زبان میں آغا میر نصیر خان نے دریافت کر کے شائع کرایا۔ اس کا اسی نام سے اردو ترجمہ میر عبداللہ جان جمالدینی اور پروفیسر نادر قمبرانی نے کیا ہے۔ یہاں یہ حوالہ دینا بھی ضروری ہے کہ بلوچی اکیڈمی کو بلوچستان کے دو ماہرین تعلیم اور اسکالر جناب پروفیسر انور رمان اور پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا تعاون حاصل رہا۔ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بہت بڑے فارسی دان ہیں۔ انہوں نے بلوچستان کے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ'' بلوچستان میں فارسی شاعری'' اکیڈمی سے شائع کرایا۔ فارسی کے بلوچستانی شعراء میں گل محمد ناطق اور حلیم اللہ حلیم کا ممتاز مقام رہا ہے۔ ناطق کا کلام'' جوہر منظم'' اور حلیم اللہ حلیم کا دیوان'' دیوان حلیمی'' کے نام سے چھپوایا گیا ہے۔ ایک ذریعہ نے تصدیق کی ہے کہ جناب طاہر محمد مرزا ان مسودات کے حصول میں اکیڈمی کے مددگار بنے۔ حضرت غلام حیدر شاہ حنفی جو بلوچستان اور سندھ میں ہزاروں لوگوں کے مرکز عقیدت رہے تھے۔ فارسی میں اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے۔ آپ کا دیوان'' گلدستہ حنفی'' اکیڈمی نے ان کے صاحبزادے غلام علی شاہ مسافر کے ذریعے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔

بلوچستان میں قدرت کی عطا کردہ بے پناہ دولت زمین کی کوکھ اور پہاڑوں کے دل میں موجود ہے اس کے بارے میں جدید سائنسی علوم سے پوری طرح بہرہ یاب نہ ہونے کے باعث جو کچھ لکھا گیا نہ ہونے کے برابر ہے۔ آثار قدیمہ پر جناب ملک محمد سعید نے اور بلوچستان کے جغرافیہ پر جناب محمد حسن بلوچ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ البتہ ثقافت کے موضوع پر اس سے کچھ زیادہ مواد اکیڈمی نے پیش کیا ہے۔'' راوراہ بند'' بلوچستان کے قبائلی تشخص کو ابھارنے کی غرض سے جناب محمود مری نے لکھی ہے اور بلوچستان کے علاقائی رسومات پر ملک محمد رمضان نے تحقیق کی ہے۔ گل بہار بھی بلوچستان کے قبائلی امور سے متعلق ہے جو عزیز محمد بگٹی کے قلم کا اعجاز ہے۔ گیتوں میں بلوچی ثقافت کو عبدالقادر اشیر شاہوانی نے دریافت کیا ہے۔

جوانسال بگٹی کلاسیکی عہد کے آخری شاعر ہیں کہ انکی شاعری میں تصوف و اخلاقیات کا گہرا رنگ ہے ان کی زندگی میں ان کا کلام بہت بڑے پیمانے پر گویوں نے ازبر کرلیا اور اس میں بلکل مبالغہ نہیں کہ

موجودہ زمانے میں مشرقی بلوچستان کے علاقوں میں مست توکلی، جام درک اور جوانسال کا کلام محفلوں کی رونق ہے جوانسال بگٹی کا کلام دو جلدوں میں بلوچی اکیڈمی سے شائع کیا گیا ہے، جلد اول کے مرتب بروایت مولوی نور محمد دہقانی اور جناب عطا شاد ہیں جبکہ جوانسال پر دوسری کتاب میر گلزار خان مری نے مرتب کی ہے۔

بلوچی اکیڈمی نے صرف مسودات حاصل کر کے کتابیں شائع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ عصر حاضر میں تخلیق ہونے والے ادبی مسائل و معاملات بھی پیش نظر رکھے مگر وسائل کی کمیابی کا تقاضہ تھا کہ نو تخلیق ادب پر لکھی جانے والی کتابوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ بہترین مضامین نظم و نثر کو انتخاب کی صورت میں مرتب و مدون کیا گیا۔ مضامین کو "گشین رد انک" میں میر صورت خان مری نے افسانوں کے انتخاب کو "گچین از مانک" کے نام سے میر عبدالحکیم بلوچ نے "گشین شاعری" جناب عطا شاد نے ترتیب دی ہے۔ حال ہی میں ریڈیائی ڈراموں کا انتخاب "گچین کسمانک" کے نام سے جناب عبدالقادر اثیر شاہوانی نے مرتب کیا۔ بہ ایں ہمہ دو تین کتابیں اب ایسی بھی نظر سے گزری ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیڈمی نے جدید بلوچی ادب کی اشاعت کی جانب توجہ کر لی ہے۔ ان کتابوں میں افسانوں کا ایک مجموعہ "سانکل" کے نام سے غنی پرواز کے طبع زاد افسانوں پر مشتمل ہے، شاعری میں میر گل خان نصیر کا کلام "پرنگ" اور منیر احمد بادینی کا لکھا ہوا ناولٹ "ریکانی تل ءِ ھلکے" شامل ہیں۔

تنقیدی مضامین میں میر عاقل خان مینگل کی کتاب "لوز انکی ایراد گیری" بھی دور حاضر کے ادبی احوال و حقائق کا احاطہ کرتی ہے۔

سیاست و صحافت کے تعلق سے بھی بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ایک ایک کتاب شائع کی ہے۔ صحافت پر جناب کمال الدین احمد کی کتاب "صحافت وادی بولان میں" اور جمہوریت کی تشریح و تعبیر میں مشہور صحافی مرحوم غلام محمد شاہوانی کے مضامین جناب بشیر احمد بلوچ کی وساطت سے حاصل کر کے "اولسی واجہی" کے نام سے پیش کیے ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے کچھ تراجم بھی شائع کیے ہیں ان میں پاکستانی اور غیر ملکی زبانوں میں غوث بخش صابر کا ترجمہ "ملگوار" کے نام سے شائع کیا ہے۔ The Great Baloch کا ترجمہ جناب عبدالغفار ندیم نے "چاکر اعظم" کے نام سے کیا ہے، پنج کتاب کی پہلی کتاب "کریما" اسی نام سے پیر محمد زبیرانی کی جودت فکر کا حاصل ہے۔ میر شیر محمد مری کی کتاب" "بلوچی زبان و ادب کی تاریخ" کا ترجمہ آغا میر نصیر خان اور پیر محمد زبیرانی نے کیا ہے۔ "کوردگال نامک" جواخوند صالح محمد نے فارسی میں

لکھی ہے جس کا اوپر حوالہ آ چکا ہے اسی نام سے میر عبداللہ جان جمالدینی اور پروفیسر نادر قمبرانی نے ترجمہ کیا جب کہ گلستان سعدی کا فارسی سے بلوچی میں ترجمہ میر محمد حسین عنقا مرحوم نے مکمل کیا۔ تراجم کے سلسلے میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کچھ کلام میر گل خان نصیر نے بلوچی میں منظوم کر کے'' شاہ لطیف گشیت'' کے نام سے کتابی شکل دی ہے۔ علامہ محمد اقبال کے بارے میں میر مٹھا خان مری نے درگال سپرد قلم کی ہے۔

ان علمی ادبی خدمات کے علاوہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے تدریسی ضرورتوں کے لیے بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں ذیل میں ان کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

بتل وگالوار	ضرب الامثال اور محاورے	غوث بخش صابر
بلوچی اردو لغات	لغت	میر مٹھا خان، صورت خان
بلوچی گرامر	گرامر	آغا میر گل خان نصیر
کارگونگ	بلوچی مصادر	آغا میر گل خان نصیر
لوز ربند	گرامر	آغا میر گل خان نصیر
بمال	بلوچی الفاظ	غوث بخش صابر، پیر محمد زبیرانی
گوشتن	ضرب الامثال، محاورے	میر گلزار خان مری
کتاب بلوچی	بول چال	کمالان گچکی
بلوچی گرامر	گرامر	میجر موکلر، محمد بیگ بلوچ
انگلش بلوچی براہوئی بول چال	بول چال	آغا میر گل خان نصیر
اے ٹیکسٹ بک	ٹیکسٹ بک	میر بشیر احمد بلوچ
پرشین پہلوی لغت	لغت	میر عاقل خان مینگل
بلوچی اردو بول چال	بول چال	عزیز محمد بگٹی
بلوچی بومیا	بلوچی رسم الخط	حاجی عبدالقیوم بلوچ

سیّد ہاشمی اکیڈمی، کراچی

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے بعد بلوچی ادب کی ترویج و اشاعت میں سیّد ہاشمی اکیڈمی کراچی کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے جو مرحوم سیّد ظہور شاہ کی خدمات کی یاد زندہ رکھنے کے لیے قائم کی گئی ، سیّد ظہور شاہ جب مارچ ۱۹۷۸ء میں وفات پا گئے تو ان کی غیر مطبوعہ تحریریں ادب دوست حلقوں کے لیے گوہر نایاب بن کر رہ گئیں ، شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں لاتعداد کتابیں لکھیں ، مضامین لکھے ، ان میں سے کچھ کو کتابی خصوصیت سے '' سیّد گنج '' لغت جو ہزار سے بھی زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ سیّد ظہور شاہ نے اپنی اس محبت شاقہ کے حوالے سے خود لکھا تھا کہ ۔

'' جیسے کہ میں اپنے آپ کو پاتا ہوں اپنی قوم اس کے سرکردہ افراد اور دل کے مفلس دولت مندوں کو دیکھ رہا ہوں اور اپنی ناپائدار حیات کو '' سیّد گنج '' کو بمشکل چھپتا ہوا دیکھ سکوں گا ۔ یہ بات نہیں کہ میں نے اس کی اشاعت کے لیے سعی نہیں کی ہے یا یہ بات کہ یہ لوگوں کو پسند نہیں ، جو کوئی مجھ سے ملتا ہے جسے ذرا بھی ادب سے دلچسپی ہے وہ اس (لغت) سیّد گنج کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے جو بھی پڑھا لکھا ، شاعر یا ادیب جس سے میں ملا ہوں اس کی طرف سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ '' بلوچی ڈکشنری کب چھاپ رہے ہو '' میں اس کا کیا جواب دوں ۔ البتہ میرا ارادہ ہے کہ میں ایک چھوٹا سا کتابچہ چھپوا کر اس میں ان تمام لوگوں کے نام گنواؤں جن کے پاس میں '' سیّد گنج '' یا دیگر بلوچی کتب کی اشاعت وطباعت کے سلسلے میں حاضری دی ۔ انہوں نے مجھے کیا جواب دیا ۔ تاکہ میری موت کے بعد بلوچ قوم مجھے الزام نہ دے ۔ ''

اور جناب منصور بلوچ لکھتے ہیں ۔

'' وہ دن بھی آ ہی گیا ، جو نہ آتا تو اچھا ہوتا ۔ احمد زبیر اور محمد بیگ بیگل سرہانے بیٹھے تھے کہ سیّد ہاشمی نے سرنہوڑا کے کہا مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ میں مر رہا ہوں ، افسوس ہے تو صرف یہ کہ میں اپنا کام مکمل نہ کر سکا ۔ ویسے بھی کار جہان کسی نے کب پورا کیا ہے ۔ ''

مگر کراچی کے چند ادب دوستوں نے جن کے سرخیل حاجی احمد زبیر تھے اور جن کو جی ۔ آر ۔ ملا ، محمد بیگ بیگل ، منصور بلوچ ، عابد آسکانی ، علی بلوچ ، مبارک قاضی ، محمد عمر سربازی ، عبدالغفار رئیس ، عیسیٰ

سرباز ی اور دوسرے پرجوش اہل قلم کا تعاون حاصل تھا۔ یکم اپریل ۱۹۸۳ء کے دن سید ہاشمی اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ مقامی دوستوں نے بھی اور خلیجی ریاستوں میں بلوچوں کی ادبی تنظیموں جس میں سر فہرست ''امارات میں سیدلبزانکی دیوان'' تھا اپنی دلچسپی اور وسائل کی فراہمی میں بھی پیچھے نہ رہا۔ سید ہاشمی اکیڈمی نے ایک طرف سید گنج کے چھاپنے کی تیاریاں کیں دوسری جانب سید ہاشمی کی کتابوں کی اشاعت میں بھی سرگرم رہی چنانچہ سید کی غیرمطبوعہ تحریریں ایک ایک کر کے چھپنے لگیں۔

سید ظہور شاہ نے اپنی زندگی میں اپنی گرہ سے جو کتابیں چھاپیں ان کی فہرست سید ہاشمی کے ذکر کے تحت دی جا چکی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد اب تک سید ہاشمی اکیڈمی نے ''برمش'' اور ''سچ'' کے نام سے دو انتخاب چھپوائے جن میں اہل قلم نے سید ہاشمی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیے۔ اکیڈمی نے اب تک تین کتابیں جن میں دو شاعری سے متعلق ہیں اور ایک میں سید سے ادباء کی خط و کتابت چھپوائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی سید ہاشمی اکیڈمی کراچی نے بہت سے ادیبوں، شاعروں کی کتابیں چھپوائی ہیں۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے بعد سب سے زیادہ کتابوں کی اشاعت کا شرف اسے حاصل ہے۔

سید ہاشمی سے متعلق کتب ذیل درج ہیں۔

برمش	مضامین، نظم و نثر
سچ	مضامین، نظم و نثر
بچکانیں سسا	مجموعہ کلام
شنکیں شہجو	مجموعہ کلام
سیدنمدی	خط و کتابت

دوسرے ادباء اور شعراء جنہیں سید ہاشمی اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔

چیھال	مجموعہ کلام	مراد ساحر	انعام یافتہ
بڑن	مجموعہ کلام	جی۔ آر۔ ملا	
گلیں باندات	مجموعہ کلام	عبدالمجید گوادری	انعام یافتہ
گل گال	مجموعہ کلام	میر گل خان نصیر	
بینار		عباس علی زیمی	
حسکیں رکھ سوز نہ بنت		اللہ بخش بزدار	انعام یافتہ

آزات جمالدینی اکیڈمی، کراچی

آزاد جمالدینی جو بلوچی زبان کے محسنین میں صف اول میں ہیں ان کی خدمات کا ذکر رسائل و جرائد کے ذیل میں ماہنامہ ''بلوچی' کراچی کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک محبِ قوم بلوچ تاجر جناب عبداللہ بلوچ کے ہونہار، نوجوان طالب علم صاحبزادے وہاب عبداللہ نے جناب رحیم بخش آزاد، جناب لال بخش رند، جناب مراد آوارانی مرحوم اور دوسری زبان کے دوستوں کی مدد سے آزاد جمالدینی اکیڈمی کراچی غالباً ۱۹۸۴ء میں آزاد جمالدینی کی وفات کے بعد قائم کی، رحیم بخش آزاد اور لال بخش رند ترقی پسند دانشوروں میں ہیں۔ان کے انتخاب بھی ایسے ہی ادباء اور شعراء کو متعارف کراتے ہیں۔

آزات جمالدینی اکیڈمی نے سب سے پہلے مرحوم آزات جمالدینی کا کلام ''ژژن'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔آزات جمالدینی نے اپنا ابتدائی کلام ۱۹۵۳ء میں بلوچی پبلی کیشنز کی مدد سے ''مستیں توار'' کے نام سے شائع کیا تھا جس کا اردو ترجمہ مشہور ترقی پسند ادیب انجم قزلباش نے کیا تھا۔ 'ژژن'' میں اس کتابچے کی نظمیں آزاد کی دوسری منظومات کے ساتھ ملا کر شائع کی گئی ہیں، تعارف مراد آوارانی، دیباچہ میر عبداللہ جان جمالدینی اور تاثرات جناب یوسف نسکندی، محمد صدیق اور گلاب بلوچ نے تحریر کیے۔

اس ادارے کی دوسری کتاب مشہور قوم پرست رہنما اور شاعر میر محمد حسین عنقا کا کلام ''توار'' ہے جو ۱۹۸۶ء میں شائع کیا گیا۔۱۹۸۷ء میں ایک اور معروف سخنور میر آدم حقانی کا مجموعہ کلام ''درون'' شائع کیا گیا۔جناب اکبر بارکزئی جو بلوچی زبان و ادب کے لیے کام کرنے والوں کے پیشرو ہیں۔ان کا مجموعہ کلام ''روچا کئے کشت کنت'' بھی آزات جمالدینی اکیڈمی نے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔''توار'' اور ''روچا کئے کشت کنت'' اکادمی ادبیات پاکستان کی انعام یافتہ کتب میں سے ہیں۔

ملا فاضل اکیڈمی، تربت، کراچی

کلاسیکی دور کے مشہور شاعر ملا فاضل رند، کی یاد میں کراچی اور تربت مکران میں ملا فاضل اکیڈمی نے ادبی کام کیے۔ سب سے پہلے حاجی احمد زبیر کی کتاب ''زپتیں زہیر'' چھپوائی اور بعدازاں مشہور ترقی پسند شاعر مراد ساحر کا مجموعہ کلام ''پاہار'' کے نام سے چھپا، یہ دونوں کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ ملا فاضل اکیڈمی، تربت مختلف علمی ادبی اداروں کے انضمام کے نتیجے میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۱ء میں قائم کی گئی۔ ''بانگو'' کے نام سے فروری ۱۹۹۲ء ایک انتخاب شائع کرایا۔ حال ہی میں ملا فاضل اکیڈمی تربت ہی کے اہتمام سے جناب ابراہیم عابد کا ایک اور مجموعہ کلام ''نمیران'' شائع ہوا ہے جبکہ ''مرادانی منزل'' بلانی ہار'' ''زنداپ'' زندء اینکیں رہسر اں'' زردءنہال اور درور شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے منتظمین میں مشہور شاعر بشیر بیدار اور ابراہیم عابد قابل ذکر ہیں جن کی کتابیں دوسرے اداروں سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ملا فاضل اکیڈمی کے ناصر آباد، تمپ، پیدارک، شہرک اور پسنی میں بھی ذیلی دفاتر ہیں۔

عزت اکیڈمی، پنجگور

گذشتہ کئی برسوں سے پنجگور میں عزت اللہ پنجگوری کی یاد اور بلوچی ادب میں اس رومان کے حوالے سے جو "عزت اور مہرک" کے درمیان رہا ایک ادبی ادارہ پنجگور میں عزت اکیڈمی کے نام سے قائم ہے۔ جس کے مقاصد میں بالضرور عزت اللہ کی شاعری کی بازیافت اور اس عشقیہ داستان کی گم گشتہ کڑیوں کو باہم جوڑنا ہے۔ اگرچہ اب تک اس کی تحقیق سامنے نہیں آسکی ہے۔ مگر جناب حاجی عبدالقیوم بلوچ، حاجی عنایت اللہ قومی، کریم آزات، فقیر محمد عنبر جیسے اسکالر اور ادب پرور اہل قلم کی سرپرستی اور توجہ سے ادبی معاملات خصوصاً اشاعت وطباعت میں اس ادارے نے اپنا وجود منوالیا ہے۔ عزت اکیڈمی پنجگور کی جانب سے اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں حاجی عنایت اللہ قومی کے کلام پر مشتمل دو کتابیں "زرد ء ارمان" "دل ء توار" بشیر شہزاد کی کتاب "سوگند" اور جناب صیاد شتیاری کے افسانوں کا مجموعہ "ہون ہوشام" قابل ذکر ہیں۔ "ہون ہوشام" کو اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔

بلوچی ادبی بورڈ، کراچی

مشہور شاعر اور بلوچ اہل قلم قاضی عبدالرحیم صابر جن کا درس و تدریس سے گہرا رشتہ رہا ہے انہوں نے نہ صرف ایک پندرہ روزہ اردو بلوچی اخبار بلوچی ادبی بورڈ کراچی کے اہتمام سے جاری رکھا بلکہ اپنی اور دوسرے مشہور و معروف لکھنے والوں کی بھی اشاعت و طباعت کے سلسلے میں رہنمائی کی۔ بلوچی ادبی بورڈ نے سب سے پہلے حضور سرور کائنات ﷺ کی حیات طیبہ پر ''سردار دو جہان ﷺ''، ''صابر ء گفتار'' شائع کیں، بلوچستان کی وادیوں میں کئی اور کتابیں بھی اس ادارے کی فہرست پر ہیں۔ بلوچی ادبی بورڈ ہی کی نگرانی میں مشہور شاعر جناب میر عیسیٰ قومی کا مجموعہ کلام ''گلدستہ قومی'' شائع ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں اکادمی ادبیات پاکستان نے انعام سے نوازا۔

ادارہ ثقافت بلوچستان، کوئٹہ

ادارہ ثقافت بلوچستان، ثقافتی امور کی انجام دہی کیساتھ بلوچی زبان کی طباعت واشاعت میں بھی سرگرم ہے۔ادارہ ثقافت بلوچستان نے بلوچی زبان کے بلند پایہ ادیب اور محقق بشیر احمد بلوچ کا لوک کہانیوں پر مشتمل وہ ترجمہ شائع کیا جو آپ نے مشہور متشرق مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کی کتاب A Text Book on Balochi Language سے اخذ کر کے بلوچی لوک کہانیوں کو اردو زبان میں متعارف کرایا ہے۔میر گل خان نصیر کی کتاب ''شیرین و دوستین'' کا منظوم اردو ترجمہ بھی ادارہ ثقافت نے شائع کرایا اس کتاب کا ترجمہ غوث بخش صابر نے کیا ہے جس کو شوہاز پبلی کیشنز نے اور مزید دو منظوم اردو ترجمے شامل کر کے شائع کیا۔جو قدیم بلوچی اشعار، داستانوں اور رحم علی مری کے کلام پر مشتمل ہے جسے صابر نے بلوچی میں منتقل کیا ہے۔

متعدد دیگر ادب دوست اداروں نے ایک ایک دو دو کتابیں چھپوا کر بلوچی زبان وادب کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ان کے ذکر سے پہلے ملک میں موجود قومی سطح کے ادبی اداروں کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔سال اقبال کے موقع پر علامہ اقبال کی حیات اور ان کی بصیرت افروز شاعری پر ''درگال'' کے نام سے میر مٹھا خان مری نے اور علامہ اقبال کے عنوان سے غوث بخش صابر نے اقبال اکیڈمی سے کتابیں پرنٹ کرائیں اول الذکر میر مٹھا خان مری کو انعام اور گولڈ میڈل سے نوازا گیا جبکہ حال ہی میں علامہ اقبال کے افکار کو بلوچی زبان میں روشناس کرنے کے لیے اقبال اکیڈمی نے غوث بخش صابر کی ایک اور کتاب ''لال ءلقا'' شائع کی ہے۔

لوک ورثہ اسلام آباد نے مشہور بلوچی عشقیہ داستان ''شئے مرید حانی'' کا منظوم اردو ترجمہ اور ''مست توکلی'' کے کلام کا نثری ترجمہ نہایت خوبصورت انداز میں شائع کیا۔

مرکزی اردو بورڈ نے پاکستانی زبانوں کی لغت شائع کی جس میں بلوچی زبان کا حصہ عطا شاد نے مرتب کیا جبکہ بلوچی ثقافت اور معاشرتی اصطلاحات پر مشتمل ایک کتاب ''بلوچی'' بھی عطا شاد نے

مرکزی اردو بورڈ لاہور کے لیے لکھی۔

قائداعظم اکیڈمی کراچی سے قائداعظم کی حیات اور تحریک پاکستان پر ''سکین'' کے عنوان سے بلوچی کتاب طبع کی گئی اسے غوث بخش صابر نے لکھا۔ جناب انعام الحق کوثر کی کتاب ''تحریک پاکستان بلوچستان میں'' میر مٹھا خان مری نے بلوچی میں منتقل کیا ہے۔ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کوئٹہ نے بانی پاکستان کی تقاریر کا بلوچی ترجمہ شائع کیا جو عبدالقادر شاہوانی کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ پی آئی ڈی سے مختلف اوقات میں ''الس'' کے علاوہ مضامین اور ملی نغمات کے انتخاب شائع کیے گئے۔ ایک ایسا کتابچہ سید عابد رضوی نے ''گل زمین'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔

ہجرہ کمیٹی اسلام آباد نے ''میں پاکستانی ہوں'' کا ترجمہ ''من پاکستانی آں'' میر مٹھا خان مری اور غوث بخش صابر کے ترجمے پر مشتمل شائع کرائی۔

اکادمی ادبیات پاکستان

اکادمی ادبیات پاکستان کو قائم ہوئے ایک عرصہ ہوا ہے۔ابتدائی برسوں میں پاکستانی زبانوں کی ترقی کی جانب زیادہ توجہ نظر نہیں آتی تھی۔خصوصاً بلوچی زبان تو مکمل طور پر نظرانداز رہی مگر اب کچھ تبدیلیاں خوش آئند ہیں۔خصوصیت سے عوامی حکومت کے دور میں اکادمی ادبیات پاکستان پوری طرح فعال ہے۔اکادمی کے سہ ماہی ''ادبیات'' میں بلوچی زبان کے منتخب شہ پارے اور تراجم نے بلوچی زبان میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔اس کے علاوہ اکادمی کے اشاعتی شعبے سے جام درک کے کلام کا اردو ترجمہ ''درچیں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔سیّد ہاشمی کا ناول ''نازک'' جو پہلا بلوچی ناول ہے اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔محترمہ ثاقبہ رحیم الدین نے بچوں کے لیے ایک کتاب ''جاگو جاگو'' لکھی ہے۔غوث بخش صابر نے اس کا بلوچی ترجمہ کیا ہے۔یہ کتاب اکادمی نے چھاپی ہے۔بلوچ صوفی شعراء پر ایک مسودے کی طباعت پر کام ہو رہا ہے لیکن سب سے بڑھ کر قابل ستائش ''پاکستانی ادبیات'' کا اجرا ہے جس میں پاکستانی زبانوں کی تخلیقات خود ان زبانوں میں مرتب کر کے پیش کی جا رہی ہیں۔اس کا پہلا شمارہ قابل ستائش تھا۔دوسرے شمارے میں پاکستانی زبانوں میں ''مزاحمتی ادب'' پر نظم و نثر کا انتخاب بلاشبہ ایک اور اعزاز ہوگا جو اس ادارے کو پاکستانی زبانوں کے حوالے سے حاصل ہے۔

پبلشرز

بلوچی پبلی کیشنز، کراچی، کوئٹہ

بلوچی پبلی کیشنز کے نام سے دو الگ الگ اداروں کے نام ملتے ہیں۔ایک کا تعلق کراچی اور دوسرے کا کوئٹہ سے بنتا ہے۔کراچی سے بلوچی پبلی کیشنز نے سب سے پہلے ۱۹۶۹ء میں میر گل خان نصیر کی کتاب ''کوچ و بلوچ'' شائع کی ہے۔اس میں میر گل خان نصیر کی مؤرخانہ توجیہات کے ساتھ ہی Mr Long worth dames کی تحقیق The Baloch race کی تشریحات بھی شامل ہیں۔جبکہ یہیں سے کمیونزم کے بانیوں کارل مارکس، فیڈرک اینگلز اور ولادی میر ایلیچ لینن کی حیات اور فلاسفی کو ''لکو'' کے نام سے منصور بلوچ نے شائع کرایا ہے۔

بلوچی پبلی کیشنز، کوئٹہ۔پوسٹ بکس نمبر ۱۸۹ نے بھی کئی ایک اردو بلوچی کتابیں شائع کروائی ہیں۔ان میں الفت نسیم کا مجموعہ کلام ''حاز گیں ریش'' عبدالرحمن غور مرحوم کی ''تئی دشمیں گفتار'' اور محمد خان مری کی دو کتابیں ''خزائن کی سرزمین'' ''گلدستہ صحت'' شامل ہیں اگرچہ اس اشاعتی ادارے کا تعارف اس کی شائع کردہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔''آز گین ریش'' ۱۹۸۴ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا انعام مل چکا ہے۔

بہارگاہ پبلی کیشنز، کراچی

بہارگاہ پبلی کیشنز کراچی جناب عابد آسکانی کی نگرانی میں بلوچی زبان وادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کی جانب سے ''بہارگاہ'' کے نام سے ایک ادبی جریدہ دو ڈھائی سالوں تک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ ''گل کار چکن کار'' تالیف جناب صباد شتیاری ''مزن بورء بلوچ لچہ کار،'' عابد آسکانی اور ''پلگاریں دروت'' جناب پیر شئے تگری کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں، موخرالذکر کتاب میں خلیج میں بسنے والے شعراء کا تعارف مع کلام نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔

جناب بشیر بیدار نے تین مجموعہ ہائے کلام ''گور بام، ھژام کریاب'' کے نام سے اپنی سعی وکوشش سے طبع کرائے ہیں چونکہ یہ تینوں کتابیں اس وقت دستیاب ہیں اس لیے ان کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

نوائے وطن پبلی کیشنز

''نوائے وطن'' ایک اخبار ہی نہیں مکتبہ فکر تھا جس کی ادارت میر گل خان نصیر، میر غلام محمد شاہوانی کرتے رہے تھے۔ میر غلام محمد شاہوانی خود ایک تحریک تھے۔ صحافتی جہان میں حق گوئی و بیباکی روشن خیالی، آزادی اظہار اور بلوچ پرستی نے ''نوائے وطن'' کو ایک یادگار نام عطا کیا۔ میر غلام محمد شاہوانی کی وفات کے بعد یہ اخبار کئی سالوں تک معرض التوا میں رہا۔ ملک محمد پناہ جو تحریک آزادی کے ایک سپاہی بڑے پائے کے ادیب و دانشور تھے۔ انہوں نے ''نوائے وطن'' کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام دیا۔ یہ اخبار اب بھی جاری ہے۔ اس ادارے نے منیر عیسیٰ کے افسانوں کے دو مجموعے ''کپند'' اور ''گر کی تل'' شائع کیے۔ اسی ادارے نے ''گچین گنج'' کے نام سے مغربی ممالک کے شعراء کے کلام فضل خالق کا ترجمہ بلوچی میں چھاپا ہے۔ لبزانکی سرچمگ پنجگور نے ''تل و توار'' کے نام سے ایک انتخاب ''دیدگیں وانگ'' کے نام سے کہنہ مشق شاعر کمال کھدائی کا مجموعہ کلام شائع کیا۔ کیچ ڈگری کالج تربت کے طلباء کے رشحات قلم سے مزین ہو کر چھپتا ہے جبکہ کیچ پبلی کیشنز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی تھا جو ملا فاضل اکیڈمی میں ضم کیا گیا اس ادارے نے ''شبم'' کے نام سے ابراہیم عابد کا مجموعہ کلام شائع کیا ہے۔ پاک نیوز تربت نے نصیر شاہین کی کتاب ''زڑن و شوہاز'' اور میر عیسیٰ قومی کا دوسرا مجموعہ کلام ''گل بہار'' چھاپا ہے۔

قلات پبلشرز، کوئٹہ

بلوچستان میں ہر گوشے میں غیر بلوچ ادبی شخصیتیں بلوچستان اور بلوچ کے لیے مخلصانہ خدمات میں مصروف و مشغول رہی ہیں ان میں گوشہ ادب کے بخاری برادران اور قلات پبلشرز کے جناب ملک زمرد حسین مرحوم کے اسماء قابل احترام ہیں۔ بخاری برادران کے ادارے گوشہ ادب نے تجارتی پیمانے پر بلوچستان کے بارے میں کئی ایک تاریخی، معاشرتی کتابیں انگریزی اور اردو میں شائع کرائی ہیں۔ متعدد اہم کتابوں کے تراجم کرائے ہیں جبکہ جناب ملک زمرد حسین بلوچستان کے سیاسی اکابرین کی صف میں ممتاز مقام کے حامل رہے۔ سیاسی رفاقت کے ذریعے ان کی توجہ بلوچی ادب نے بھی جذب کر لی۔ میر گل خان نصیر اور ملک زمرد حسین میں گہرے دوستانہ روابط نے بھی بلوچی ادبی کی ترویج و پیش رفت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قلات پبلشرز جو مستونگ اور کوئٹہ میں پبلشنگ کا دیرینہ تجربہ رکھتا ہے۔ ملک زمرد حسین کی ملکیت ہے اس ادارے سے میر گل خان نصیر کا انقلابی کلام ''گرند'' کے نام سے منظر عام پر آیا جبکہ عزیز محمد بگٹی کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''نودور گام'' بھی یہیں سے شائع کیا گیا۔

مکتبہ بلوچی دنیا، ملتان

بلوچستان سے باہر ایک ایسے وقت بھی جبکہ بلوچی ادب گھٹنوں کے بل چل رہا تھا۔ ملتان میں حضرت مولانور احمد خان فریدی نے ''مکتبہ بلوچی دنیا کی'' بنیاد ڈالی۔ بلوچوں کی تاریخ، ثقافت، قبائلی روایات، رسومات اور طرز حیات پر ''بلوچی دنیا کے نام سے ۱۹۵۷ء میں ایک رسالہ جاری کیا۔ مولانور احمد خان فریدی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ایک صاحب طرز ادیب، مورخ اور محقق تھے انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے تاریخ بلوچستان بھی لکھی، چاکر اعظم اور بلوچ ہیروؤں کو متعارف کرانے میں بہت سے مضامین بھی سپرد قلم کیے۔ بلوچی دنیا، ملتان کے علاوہ اب کوئٹہ سے بھی ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا گیا ہے اور اپنے مدیر و محب قوم شخصیت چاکر خان بلوچ کی رہنمائی میں بلوچی ادب کی مشاطہ گری میں معروف ہے۔ عبدالرحمٰن غور مرحوم کا مجموعہ کلام ''متاع بردہ'' اس ادارے کی پیش کش ہے۔

بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن ماضی میں بلوچی زبان وادب کے شعبے میں نمایاں رہا ہے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء میں اس تنظیم نے مقامی اہل قلم کے تعاون سے ''بولان نامہ'' کے دو نمائندے انتخاب شائع کرائے ایسا ہی ایک انتخاب نظم ونثر بلوچی میں ڈیرہ غازی خان سے ''گروخ ادبی گل'' نے'' یاتانی تاخ'' کے نام سے پیش کیا ہے جبکہ بجار اور گروک کے نام سے بی ایس او، اب بھی وقتاً فوقتاً ادبی امور میں طلباء کی دلچسپی بڑھاتی رہتی ہے۔

لبزانکی کاروان

لبزانکی نے کاروان کے نام سے مضامین نظم ونثر میں اضافہ کیا ہے۔
ندکار پبلی کیشنز کے بینر تلے غنی غریب کا مجموعہ کلام ''ماہ گل و ماہ گون'' سید لبزانکی مجلس کی جانب سے جناب محمد بیگ بلوچ کے طنز و مزاح پر مشتمل مضامین ''شکل و باجین'' کے نام سے ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ جناب بشیر احمد بلوچ نے ملا فاضل مرحوم کے برادر خورد ملا قاسم کا کلام ''پہہ کیس اشرنی'' بلوچستان پبلی کیشنز کے ذریعے مرتب کیا ہے۔جبکہ رائل بک کمپنی کراچی کی وساطت سے میر جان محمد دشتی نے بلوچستان کے ثقافتی ورثے پر انگریزی The Baloch Cultrul Heritage تصنیف کی ہے۔

نساء ٹریڈرز

گوشہ ادب کا ایک اور ذیلی ادارہ ہے۔ جس نے میر گل خان نصیر کی کتاب "بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں" ڈاکٹر شاہ محمد مری کی کتاب "مری بلوچوں کی جدوجہد" اور طاہر محمد خان کی "سیاسیات بلوچستان" شائع کی ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ کچھ اہل قلم ایسے ہیں جنہوں نے اپنی کتابیں اپنی مدد سے چھپوائی ہیں۔ ان میں مشہور شاعر اور ادیب جناب غوث بہار کی "زر گوات" جو بلوچی افسانوں پر مشتمل ہے اور میر احمد دہانی کا مجموعہ کلام "کاریں کارواں" میر گنج کے نام سے ایک لغت شامل ہے۔ مبارک قاضی کا مجموعہ کلام "زرنوشت" بھی ذاتی کوششوں سے شائع ہوا ہے۔

کتابیات

اربعین یمنی	ابو یحیٰ قاسم یمنی	توکلی مست	میر مٹھا خان مری
الس واجہی	بشیر احمد بلوچ	ترامپ کہنیں ترمپ	سید ظہور شاہ ہاشمی
انگر وتر ونگل	سید ظہور شاہ ہاشمی	ثقافت وادیٔ بولان میں	ادارہ ثقافت
آئینہ خاران	عبد القادر شاہوانی	جوانسال i-ii	عطا شاد، گلزار خان مری
آزگیس ریش	الفت نسیم	چاکرِ اعظم	محمد سردار خان؛ غفار ندیم
بتل وگاوار	غوث بخش صابر	لکو	منصور بلوچ
بنمال	زبیرانی، صابر	چنگھا گفتار	مومن بزدار
جنگ گنبد	رحم علی، صابر	چاچ بند	غوث بخش صابر
بلوچی کہنیں شاعری	میر شیر محمد مری	چیہال	مراد ساحر
بلوچی زبان وادب ءِ تاریخ	میر شیر محمد مری	حمل جیئند	میر گل خان نصیر
بلوچی زبان وادب کی تاریخ	سید ظہور شاہ ہاشمی	خزائن کی سرزمین	محمد خان مری
بلوچی زبان ءِ آ کبت	صبا دشتیاری	سانگل	غنی پرواز
بلوچی لوک کہانیاں	بشیر احمد بلوچ	سمو بیلی مست	میر مٹھا خان مری
صابرءِ گفتار	قاضی عبد الرحیم صابر	سید ہمدی	سید ظہور شاہ ہاشمی
صدف صدرنگ	غوث بخش صابر	سکّیں دستونک	سید ظہور شاہ ہاشمی
علامہ محمد اقبال	غوث بخش صابر	سچکانیں سسا	سید ظہور شاہ ہاشمی
کریا	پیر محمد زبیرانی	سکیس	غوث بخش صابر
گردگال تاک	آغا میر نصیر خان	شاہ لطیف گشیت	میر گل خان نصیر
گوناپ	یوسف گچکی	شپ گروک	میر گل خان نصیر

گوشتن	میر گلزار خان مری	شاشان	رزاق نادر
گری تل	منیر عیسیٰ	شہم	ابراہیم عابد
گرند	میر گل خان نصیر	شکلیں شجو	سید ظہور شاہ ہاشمی
گلدستہ صحت	محمد خان مری	شکل و ماجین	محمد بیگ بلوچ
گلدستہ قومی	میر عیسیٰ قومی	گلگال گلیس باندات	میر گل خان نصیر
گلدستہ حنفی	غلام حیدر شاہ حنفی	لل ءِ گراناز	بشیر احمد بلوچ / عبدالمجید گوادری
گچین کسانک	عبدالقادر شاہوانی	لٹریری ہسٹری	میر محمد سردار خان
گل کار چکن کار	صباد شتیاری	لوزانکی ایرادگیری	میر عاقل خان
گوربام	بشیر بیدار	شپ چراگ	بشیر احمد بلوچ
الال القا	غوث بخش صابر		